210384

نفثۃ المصدور

اور

ہندوستان کی شرعی حیثیت

سعید احمد اکبر آبادی

صدر شعبۂ سُنّی دینیات

گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سلسلۂ منشورات دینیات فیکلٹی ۔۳

پہلا ایڈیشن

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

پیش لفظ

یہ کتاب جو آپ کے پیشِ نظر ہے میرے دو مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے پہلا مقالہ ۱۹۶۵ء میں مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کی خدمت میں بطور نذر پیش کرنے کے لیے جو کتاب "نذرِ عرشی" کے نام سے شائع ہوئی تھی اُس میں شائع ہوا تھا اور دوسرا مقالہ ۱۹۶۶ء میں قسط وار مجلّہ "برہان" دہلی میں چار ماہ تک شائع ہوتا رہا تھا۔

سعید احمد اکبرآبادی
۱۵ر فروری ۱۹۶۷ء

نفحۃ المصدور

اور

ہندوستان کی شرعی حیثیت

از

سعید احمد اکبر آبادی

فہرس

تعارف

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) کی ایک تحریر کا مخطوطہ ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر نایاب ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود ابھی تک کسی اور کتاب خانے کی فہرست میں اس کا تذکرہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ بہت سے ارباب علم و تحقیق سے بھی دریافت کیا مگر کسی سے اس کا کچھ سراغ نہیں ملا۔ یہاں اس رسالے کا متن شائع کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے اسے دیکھنے کے بعد کوئی صاحب اس پر مزید روشنی ڈال سکیں۔

یہ مخطوطہ آزاد لائبریری کے ذخیرۂ سبحان اللہ خاں کی فہرست کے صفحہ ۲۱ پر ۱/۹۹ "تصوف" کے تحت درج ہے لیکن درحقیقت یہ تصوف کا رسالہ نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ امام عالی مقام کے ایک فرزند ارجمند کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ انھیں قدرتی طور پر سخت صدمہ ہوا۔ اس سلسلے میں کسی بادشاہِ وقت نے انھیں تعزیت نامہ لکھا۔ اس کے جواب میں امام صاحب نے جو خط لکھا تھا یہی تحریر وہ خط ہے۔ چنانچہ اس رسالے کے آغاز میں لکھا ہے:

"این رسالہ ایست کہ مولانا شیخ الاسلام اعظم، علامۃ العلماء فی العالم، الامام الہمام والحبر القمقام فخر الدین محمد الرازی روح اللہ روحہ و رضی اللہ عنہ بہ بادشاہِ آن زمانہ نوشتہ، در جواب تعزیت نامہ کہ ملک بر وفات پسر امام نوشتہ بود۔"

یہ رسالہ نو صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحے میں پندرہ سطریں ہیں۔ اس پر نہ کاتب کا نام ہے اور نہ سنہ کتابت درج ہے اور نہ اس شخص کا نام ہے جو اس کا جامع ہے اور جس نے ظاہراً سطورِ بالا لکھی ہیں۔

لیکن کاغذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو ڈھائی سو برس کا نوشتہ ہوگا۔ اگرچہ یہ مختصر رسالہ کہنے کو صرف ایک تعزیت نامہ کا جواب ہے لیکن درحقیقت اس میں زندگی اور موت کا فلسفہ بالکل اچھوتے اور نئے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارباب علم جانتے ہیں کہ امام رازی عام طور پر بلند پایہ فلسفی اور منطقی کی حیثیت سے اس درجہ مشہور ہیں کہ مولانا جلال الدین رومی کو بھی امام صاحب کے "رازدار دین" ہونے میں شبہ ہے لیکن اصل یہ ہے کہ امام صاحب کو اپنی عمر کے اخیر دور میں تصوف اور مسائل طریقت و معرفت سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ علامہ سبکی انھیں اہل دین اور اہل تصوف میں سے ملتے ہیں[1]

فلسفے کے ساتھ تصوف اور علوم شریعت کے ساتھ اسرار و رموز طریقت کی آمیزش ہی کا نتیجہ تھا کہ امام صاحب اخیر زمانہ میں بڑی پابندی سے وعظ کہنے لگے تھے اور ان کا وعظ اس درجہ موثر اور رقت انگیز ہوتا تھا کہ شہاب الدین غوری کے سے بادشاہ پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور وہ زار و قطار رونے لگتا تھا[2]۔ چنانچہ اس رسالے میں بھی فلسفے اور تصوف دونوں کی آمیزش و ترکیب پائی جاتی ہے اور اس بنا پر اس کا مخصوص اسلوبِ بیان و طریقِ استدلال صاف بتا رہا ہے کہ یہ امام صاحب کے سوا کسی اور کی تحریر نہیں ہو سکتی۔

یہ رسالہ حسب ذیل دس فصلوں پر مشتمل ہے:

(۱) در مثال روح انسانی۔ (۲) در فنائے ایں جثہ (۳) در اثباتِ حقیقتِ روح انسانی (۴) در حقیقتِ مرگ و احوالِ آں۔ (۵) در بیانِ دردِ فراق (۶) در بیان نصیحت و تنبیہ۔ (۷) در مراتبِ ارواحِ انسانی (۸) در بیانِ حکمتِ مرگ و دلائلِ آں۔ (۹) در حقیقت زیارت و کیفیت تجلّی ارواح۔ آخری یعنی دسویں فصل میں امام صاحب نے اپنے ذاتی رنج و الم کا ذکر کیا ہے جو انھیں بیٹے کی جوانمرگی کے باعث اٹھانا پڑا ہے۔

اس سلسلے میں تین باتیں خاص طور پر تحقیق طلب ہیں:

(الف) امام صاحب کے اس صاحبزادے کا نام کیا تھا اور اس کا انتقال کب ہوا؟

---

[1] طبقات الشافعیہ، ۵ : ۳۵

[2] بدایونی: منتخب التواریخ، ۱ : ۱۶

(ب) جس بادشاہ نے امام صاحب کو تعزیت نامہ لکھا تھا، وہ کون تھا؟

(ج) اس رسالے کا نام کیا ہے اور امام صاحب کی تالیفات میں کہیں اور اس کا سراغ ملتا ہے یا نہیں؟

(الف) امام صاحب کی اولاد کی صحیح تعداد ہمیں معلوم نہیں، البتہ اتنا ثابت ہے کہ ان کے تین صاحبزادے تو ضرور تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: ضیاء الدین، شمس الدین، محمد۔ ضیاء الدین سب سے بڑے تھے اور علمی شغل رکھتے تھے ۳ شمس الدین جن کی کنیت ابوبکر تھی، سب سے چھوٹے تھے۔ امام صاحب نے وصیت نامے میں انھیں کے متعلق لکھا ہے کہ اس بچے میں ذہانت اور طباعی کے آثار نمایاں ہیں اس لیے تعلیم و تربیت میں کافی اہتمام کیا جائے ۴۔

اب رہے تیسرے محمد، تو یہ وہی ہیں جن کے ساتھ امام صاحب کو غیر معمولی محبت و انسیت تھی اور جوانی ہی میں باپ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کا انتقال ۶۰۰ھ کے اوائل میں ہوا ہوگا۔ کیونکہ خود امام صاحب تفسیر کبیر میں سورۂ یونس کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں:

"میں نے اس سورۃ کو ہفتہ کے دن رجب ۶۰۰ھ میں ختم کیا۔ حالانکہ میں اپنے فرزند صالح محمد کی موت کے باعث بڑا ملول اور دل گرفتہ تھا"۵

امام صاحب کو محمد کی جوانمرگی کا صدمہ اس درجہ تھا کہ اس حادثے پر ایک برس سے بھی زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود جب انھوں نے شعبان ۶۰۱ھ میں سورۂ یوسف کی تفسیر سے فراغت پائی تو بیٹے کی جدائی کا غم اچانک دماغ میں تازہ ہو گیا، چند آنسو مرثیے کے اشعار کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر ٹپک پڑے۔ امام صاحب کے لیے یہ غم کس درجہ جانگداز تھا، اس کا کچھ اندازہ مرثیۂ مذکورہ کے اس شعر سے ہوتا ہے:

واقسم ان مسوا رفاتی و رمتی — احسوا بنار الحزن فی ممکن العظم

(بخدا! اگر لوگ میری بوسیدہ ہڈیوں کو بھی ٹٹولیں گے، تو غم کی آگ ان ہڈیوں کے نہاں خانے میں محسوس کریں گے)۶

---

۳ عیون الانباء فی طبقات الاطباء ۲: ۲۶ — ۴ ایضاً ۲: ۲۸

۵ تفسیر کبیر ۵: ۳۴ — ۶ ایضاً ۵: ۱۷۵

اس کے بعد سورۂ رعد کی تفسیر ختم کرتے کرتے یہ سلگتی آگ پھر بھڑک اٹھی، تو اس موقع پر بھی مرثیے کے دو شعر بے ساختہ قلم کی زبان پر آگئے ہیں۔

غرض اس میں شبہ نہیں کہ امام صاحب کو جس بیٹے کی جوانمرگی کا غم اٹھانا پڑا، اس کا نام محمد تھا۔ چنانچہ مخطوطۂ زیر بحث کی آخری فصل جس میں انھوں نے اپنے طبعی حزن وملال کا اظہار عجیب وارفتگی کے ساتھ کیا ہے اس میں بھی یہی نام مذکور ہے۔ عام قرینہ یہ ہے کہ یہ اپنے بھائیوں میں عمر میں سب سے چھوٹے ہوں گے۔ مفتاح السعادۃ میں اس کی تصریح بھی موجود ہے: ومات محمد فی عنفوان شبابہ[۷]۔ لیکن اڈورڈ فنڈیک نے معلوم نہیں کس بنیاد پر محمد کو امام صاحب کی اولاد میں سب سے بڑا بتایا ہے[۸]۔

(ب) اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ امام صاحب کے تعلقات اپنے زمانے کے متعدد بادشاہوں اور فرمانرواؤں کے ساتھ بہت گہرے اور عزیزانہ تھے۔ شہاب الدین غوری کے ساتھ تو اس درجہ کا تعلق تھا کہ ایک مرتبہ اسے ضرورت ہوئی تو اس نے امام صاحب سے روپیہ قرض لیا[۹]۔ امام صاحب خاص محل شاہی میں وعظ بھی کہتے تھے۔ ایک مرتبہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ اثنائے وعظ میں شہاب الدین غوری کو خطاب کرکے فرمایا: "اے بادشاہ! ایک وقت آئے گا، جب نہ تیری بادشاہی رہے گی اور نہ رازی کی یہ روباہ گری؛ اور ہم سب کو اللہ کے حضور میں پہنچنا ہوگا"۔ غوری پر ان فقروں کا اتنا اثر ہوا اور وہ دیر تک اس طرح روتا رہا کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا[۱۰]۔ ملا عبدالقادر بدایونی اور دوسرے حضرات نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ لیکن ملا صاحب نے اس پر اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ امام صاحب کا یہ وعظ ہر ہفتے ہوتا تھا اور بادشاہ امام صاحب کے پیروں کی جانب بیٹھتا تھا[۱۱]۔ شہاب الدین غوری کی طرح امام صاحب کے تعلقات اس کے بھائی ابوالفتح غیاث الدین غوری کے ساتھ بھی بہت گہرے تھے۔ شروع شروع میں غیاث الدین غوری پر فرقۂ کرامیہ کے اثرات تھے

---

۷ مفتاح السعادۃ ۱: ۱/۵

۸ اکتفاء القنوع بما ہو مطبوع: ۱۶۷

۹ تاریخ ابن خلکان ۱: ۵/۲

۱۰ نظم الوالہ بمظفر وآلہ ۲: ۶۸۳

۱۱ منتخب التواریخ ۱: ۱۶

لیکن امام صاحب کے قرب و اتصال کے باعث اخیر میں وہ شافعی المذہب اور علما و صلحا کا بڑا قدردان ہوگیا۔ اس نے مسجدیں اور سرائیں تعمیر کرائیں اور بڑے بڑے کار ہائے خیر سرانجام دیے۔ اس نیکی اور خلق نوازی کے باعث امام صاحب کو بھی اس کے ساتھ اس درجہ کا تعلق پیدا ہوگیا کہ انھوں نے لطائف الغیاثیہ اور بعض اور کتابیں بھی اسی کے نام معنون کی ہیں[۱۲]۔

غوری خاندان کے ان دو بادشاہوں کے علاوہ امام صاحب کے مراسم اور تعلقات خوارزم شاہی خاندان کے دو بادشاہوں علاءالدین تکش اور اس کے بیٹے محمد بن تکش سے بھی تھے۔ چنانچہ شروع میں علاءالدین تکش نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے امام صاحب ہی کو مقرر کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ امام صاحب کو یہ تعزیت نامہ کس بادشاہ نے لکھا تھا؟ ہمارا خیال ہے کہ یہ ملک محمد تکش ہے، جو عام طور پر خوارزم شاہ کے لقب سے معروف ہے۔ امام صاحب کے صاحبزادے محمد کا انتقال ہمارا قیاس ہے ۶۰۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس صورت میں علاءالدین تکش اور غیاث الدین غوری تو اس تعزیت نامہ کے مصنف اس لیے نہیں ہو سکتے کہ اول الذکر کا انتقال ۵۹۶ھ میں ہوا اور موخرالذکر کا ۲۷ جمادی الاولیٰ ۵۹۹ھ کو[۱۳]۔ رہا شہاب الدین غوری، تو اگرچہ اس کے قتل کا واقعہ ۶۰۲ھ میں پیش آیا ہے لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شہاب الدین غوری لشکر لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ پھر رہا تھا۔ ۵۹۹ھ میں وہ غزنیں سے خراسان کی طرف روانہ ہوا۔ راہ میں بھائی کے انتقال کی خبر ملی تو بادغیس جا پہنچا، اور بھائی کی مملکت اپنے بھتیجوں اور بھانجوں میں تقسیم کی۔ یہاں سے فارغ ہوا تو خوارزم کا رخ کیا اور اسے فتح کرنے کے خیال سے شہر کا محاصرہ کیے پڑا رہا یہاں تک کہ جنگ ہوئی جس میں دونوں فریق کا بہت نقصان ہوا۔ اس کے بعد وہ دریائے جیحوں کے کنارے کنارے بلخ کے ارادے سے جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں ترک اور خطا کے لشکر سے مڈبھیڑ ہوگئی جس میں اسے عظیم خسارہ برداشت کر کے اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ میدان چھوڑنا پڑا[۱۴]۔ غرض کہ ۵۹۹ھ سے ۶۰۱ھ تک کے دو برس شہاب الدین غوری کے ایسی پریشانی اور سراسیگی میں گزرے کہ ان حالات میں اس کا امام صاحب کو تعزیت کا خط لکھنا محال نظر آتا ہے! اب لے دے کے ایک

۱۲۔ منتخب التواریخ ۱: ۱۹
۱۳۔ ظفرالوالہ ۲: ۶۷۵

۱۴۔ جوزجانی بحوالہ ظفرالوالہ ۲: ۶۸۱

خوارزم شاہ یعنی محمد بن تکش رہ جاتا ہے جس نے اپنے باپ کی وفات (۵۹۹ھ) کے بعد اکیس برس تک بڑے جاہ و جلال اور طنطنے کے ساتھ حکومت کی۔ جیسا کہ بیان ہوا ہے امام صاحب سے شرفِ تلمذ بھی حاصل تھا اور امام صاحب کے غیر معمولی فضل و کمال اور جلالتِ علم کے باعث وہ ان کا اتنا قدرداں تھا کہ ابن خلکان کا بیان ہے[13]:-

اتصل بالسلطان محمد بن تکش المعروف بخوارزم شاہ حظی عندہ و نال اسنی المراتب ولم یبلغ احدٌ منزلتہ عندہ	امام رازی سلطان محمد تکش معروف بہ خوارزم شاہ سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے اور سلطان کے نزدیک جو مرتبہ و مقام آپ کا تھا۔ وہ کسی دوسرے کو میسر نہیں ہوا۔

امام رازی کا بھائی رکن الدین انھیں بہت پریشان کرتا رہتا تھا۔ امام نے اس کا تذکرہ سلطان سے کیا تو اس نے رکن الدین کی نقل و حرکت ایک مختصر علاقے میں محدود کر دی اور اس کی بسر اوقات کے لیے ایک جائداد مقرر کر دی جس کی آمدنی ایک ہزار دینار سالانہ تھی[14]۔ سلطان اگرچہ بہت وسیع المملکت اور بڑے دبدبے کا حکمراں تھا لیکن اس کی امام صاحب سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا[15]۔ امام صاحب کو بھی اس سے ایسا گہرا لگاؤ اور تعلق تھا کہ وفات سے قبل انھوں نے جو وصیت نامہ لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں: "میں اپنے بچوں کو پہلے اللہ کے اور پھر اللہ کے خلیفہ محمد (یعنی سلطان محمد بن تکش) کے حوالے کرتا ہوں[16]" سلطان شہاب الدین غوری اور سلطان محمد بن تکش خوارزم شاہ میں سخت جنگ اور خونریزی کے بعد صلح صفائی ہو گئی تھی۔ مورخین کا عام خیال ہے کہ یہ بھی دونوں پر امام صاحب کے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے ہوئی۔ ان قرائن سے پتا چلتا ہے کہ امام صاحب کے نام جس بادشاہ نے تعزیت نامہ لکھا تھا وہ یہی سلطان محمد بن تکش المعروف بخوارزم شاہ (م ۶۱۶ھ) ہے۔

اب صرف ایک سوال رہ گیا کہ اس رسالے کا نام کیا ہے؟ اور کیا امام صاحب کی کسی دوسری تالیف میں کہیں اس کا سراغ ملتا ہے یا نہیں؟ ابن ابی اصیبعہ نے امام صاحب کی تالیفات و تصنیفات

---

[13] تاریخ ابن خلکان، ۱: ۴۷۵

[14] ایضاً، ۲: ۲۳

[15] عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ۲: ۲۵

[16] ایضاً، ۲: ۲۹

کے جو نام گنائے ہیں ان میں ایک تصنیف کا نام نفثۃ المصدور ہے[19] جسے ہم "آہِ غم" کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اور دوسرے مورخوں نے امام کی تالیفات کے ضمن میں اس رسالہ کا نام نہیں لیا، لیکن ابن ابی اصیبعۃ (م ٦٦٨ ھ) دوسروں کی بہ نسبت امام صاحب سے زیادہ قریب العہد ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے امام کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور اس سلسلے میں بعد کے مورخوں کے لیے ماخذ بھی اغلباً وہی ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بیان کو درست نہ قرار دیا جائے۔

لیکن ابن ابی اصیبعہ نے بھی رسالے کا صرف نام لکھا ہے، یہ نہیں بتایا ہے کہ اس کا موضوع کیا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس رسالے کو امام صاحب کی تالیفات میں گنوایا تو ہے لیکن ساتھ ہی لکھتے ہیں "معلوم نہیں کہ کس موضوع پر ہے"[20]

قیاس کہتا ہے کہ قاضی ابن اصیبعہ نے جس رسالے کا نام نفثۃ المصدور لکھا ہے وہ یہی رسالہ زیرِ بحث ہے۔ اس کا ثبوت اول تو خود اس رسالے کا مضمون اور موضوع ہے، جو اس کے مجوزہ نام کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ امام رازی سے پہلے (اور ان کے بعد بھی) جب بھی کسی صاحبِ علم و قلم نے کسی اندوہناک واقعہ سے متاثر ہو کر کوئی چھوٹی بڑی کتاب لکھی ہے، تو اس کا نام کلاً یا جزاً عام طور پر نفثۃ المصدور ہی رکھا ہے۔ چنانچہ حاجی خلیفہ نے اس نام کے دو رسالوں کا ذکر کیا ہے[21] جن میں سے ایک شیخ قطب الدین ابوالحسن سعید بن ہبۃ اللہ الراوندی (م ٥٧٣ ھ) سے منسوب ہے اور دوسرا اشرف الدین انوشروان بن خالد سے، جو سلطان طغرل سلجوقی کا وزیر تھا جیسا کہ حاجی خلیفہ نے تصریح کی ہے، یہ کوئی مستقل کتاب نہیں تھی بلکہ شیخ صدرالدین محمد بن اسحٰق القونوی کی کتاب کا خلاصہ تھی۔ عہدِ حاضر میں ایران کے ایک فاضل شیخ عباس محدث قمی نے جب ایک رسالہ مقتل کے موضوع پر لکھا تھا تو اس کا نام بھی نفثۃ المصدور رکھا[22]۔ اس سے بھی ہمارے قیاس کو تقویت پہنچتی ہے اور گمان قریب بہ یقین ہے کہ یہ مخطوطہ امام رازی کا رسالہ نفثۃ المصدور ہے۔

---

١٩ عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ٢ : ٣٠

٢٠ امام رازی : ٤٥ (غالباً سہوِ کتابت سے ان کے ہاں کتاب کا نام "نفثۃ" (بہ ثا) کے بجائے "نفسہ" (سین سے) کیا گیا ہے۔

٢١ کشف الظنون۔ ٢ : ٦٠٨

٢٢ رضوی : فہرست کتاب خانہ آستانۂ قدس ١، ٥ : ٢٤٠

آخر میں بجا طور پر یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ رسالہ واقعی امام رازی کا چکیدہ قلم ہے، تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ خود اس رسالے میں امام موصوف کے نام کی تصریح موجود ہے اور آخر میں ان کے مرحوم بیٹے کا نام محمد بھی درج ہے اور یہ بھی مذکور ہے کہ اس حادثے پر ایک بادشاہ نے انھیں تعزیت کا ایک خط لکھا تھا۔ اور امام صاحب سے سلاطین وقت کے ذاتی اور نجی تعلقات ایک تاریخی حقیقت ہیں۔ اس کے علاوہ امام صاحب کی ایک کتاب فارسی زبان میں "ستینی" المعروف بہ جامع العلوم ہے، جو جناب مستطاب مقرب الخاقان خاں صاحب میرزا محمد خاں ملک الکتاب کی کوشش اور اہتمام سے ۱۳۲۳ھ میں بمبئی کے مطبع مظفری میں چھپی تھی۔ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، اس میں ساٹھ علوم و فنون سے متعلق امام صاحب کے چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ اس کتاب کی زبان اور انداز بیان اور طریق بحث و استدلال اور اسلوب گفتگو بالکل وہی ہے جو ہمارے زیر بحث مخطوطہ میں ملتا ہے یعنی زبان سادہ ہے، بات مختصر اور طریق بیان مقدمات اور اصول پر منقسم ہونے کے باعث منطق و فلسفہ کا پیرایہ لیے ہوئے!

یہ مخطوطہ کب لکھا گیا؟ کس نے لکھا؟ اور کس مخطوطے سے منقول ہے؟ اور اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور قدیم تر مخطوطہ کب لکھا گیا؟ اور وہ کہاں ہے؟ افسوس کہ پوری کوشش کے باوجود ابھی تک اس گتھی کے سلجھانے کا کوئی سامان پیدا نہیں ہوا۔ یہ رسالہ اسی امید پر جوں کا توں شائع کیا جارہا ہے کہ شاید کوئی محقق اس سلسلے میں مزید معلومات بہم پہنچا سکیں۔[۲۳]

سعید احمد اکبرآبادی

---

[۲۳] یہاں مجھے مولانا سید سبط حسن صاحب اورینٹل اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن سے مخطوطات کی مختلف فہرستوں سے مراجعت اور بعض معلومات فراہم کرنے میں بڑی مدد ملی

متن نفثۃ المصدور

فصلِ اوّل

در مثالِ روحِ انسانی

بر سبیلِ اجمال، مرد چوں در کشتی بنشیند و کشتی نزدیک کرانۂ دریا باشد، چناں بیند که کشتی ساکن ست و آبِ دریا متحرک، و ایں غلط ست، زیرا که کشتی متحرک ست و کرانۂ دریا ساکن. روحِ انسانی را در کشتیِ تن نشاند و آن کشتی در دنیا انداخت[1]. مردم می پندارند که کشتیِ تن ساکن ست و دریاے روزگار در حرکت، و آں غلط ست، زیرا که کشتیِ حیاتِ جسمانی که بواسطۂ جسد حاصل شود، در حرکت ست، و دریاے روزگار بحال خود باقی. پس کشتی را که قوتِ بصیرت بحدے تر شد که چیزہا چنانچه باشد ببیند از تغیرِ احوالِ روزگار برنجد، و ازیں جهت ست که مهتر و بهترِ عالم صلوٰت الله وسلامه علیه فرموده: "ارنا الاشیاء کما هی" یعنی مرا بنما چیزہا را چنانکه آن چیزہاست. والله ولی التوفیق.

فصلِ دوم

در فناے ایں جثّہ

مشاہد ایں تن را از برائے بقا نیا فریده اند زیرا که بچشم می بینم که او از حالے بحالے می گردد. کودک بود، جواں شد؛ جواں بود، پیر شد. پس اگر بر یک حال قرار گرفته بودے، باقی بودے. چوں بر یک حال قرار نگرفت، معلوم شد که او را از برائے بقا نیا فریده اند. پس هر که از وے طمعِ بقا دارد، چوں نیابد، برنجد. و بحقیقت او را از خود باید رنجید که چرا از ناپائنده پائندگی طمع داشت.

فصلِ سوم

در اثباتِ حقیقتِ روحِ انسانی

تا مر احقیقتِ خود را از مرگ فراغت حاصل نشود، بباید دانست کہ تو دیگری و تنِ تو دیگر و دلائلِ ایں سخن بسیار ست:

دلیل اوّل: آنست کہ آدمی در بزرگی ہمانست کہ در کودکی بود، زیراکہ من ہمان کسم کہ مادر مرا بزاد، و کودک بودم، جواں شدم و امروز پیر شدم، لیکن آں وقت کہ کودک بودم، یک من یا بیشتر یا کمتر، و امروز پنجاہ من باشم یا بیشتر یا کمتر۔ پس اجزاے بدن کم و بیش می شود و من در ہمہ حال یک چیز بودم۔ پس معلوم شد کہ حقیقتِ من چیزے دیگر ست، غیر ایں جثّہ و جسد۔

دلیل دوم: آنکہ مرد چوں تندرست باشد، فربہ شود، چوں بیمار شود، لاغر گردد۔ باز چوں تندرست گردد، فربہ شود۔ و ایں مرد در ہمہ حال ہماں کس بود کہ بود۔ چوں اجزاے تن مبدل می شود، حقیقتِ او باقیست۔ پس ہر آئینہ حقیقتِ او غیر ایں جثہ و جسد باشد۔

دلیل سوم: مرد در وقتِ بیداری اگر خواہد کہ عالمِ غیب را مطالعہ کند، نتواند۔ چوں بخواب رود، مطالعہ غیب او را میسر شود و بیداری سبب قوتِ تن ست۔ پس پیدا شد کہ در وقتِ بیداری کہ سببِ قوتِ تن ست، روح ضعیف ست، و از مطالعۂ عالمِ غیب عاجز۔ و در وقتِ خواب کہ سببِ ضعفِ تن ست و قوتِ روح، بر مطالعہ غیب قادر می شود۔ پس پیدا شد کہ در وقتِ قوتِ تن، روح ضعیف ست، و در وقتِ ضعفِ تن، روح قوت می گیرد۔ پس معلوم شد کہ روح کہ محل علم و فہم و معرفتِ حق است، چیزے دیگر ست غیر ایں جُثّہ و جسد۔

دلیل چہارم: اندیشہ کردن بسیار در معرفت سببِ کمالِ روح ست، زیراکہ از اندیشۂ بسیار روح از تاریکیِ نادانی بنورِ معرفتِ حق می رسد، و سعیدِ ابد می شود۔ و اندیشہ سبب نقصانِ تن ست، زیراکہ چوں مرد باندیشۂ بسیار مشغول شود۔ از خوردن و خفتن و لذات و شہوات محروم گردد و ضعف دیو ست بر تن او غالب شود۔ امّا بسیار خوردن و بلذات و شہواتِ دنیا مشغول شدن کمالِ تن ست، زیراکہ تن فربہ شود و قوت گیرد، و آں قوت سببِ نقصانِ روح

ست، و بداں کہ ہر کس [کہ] غایتِ کارِ وے خوردن و شہوت راندن ست، از ستوراں باشد، و
عاقلاں اُورا از بہائم شمرند، و بنظرِ حقارت در وے نگرند. پس چوں ہر چہ سببِ زیادتیِ تن ست
آں چیز موجبِ نقصانِ روح ست، معلوم شد کہ روح کہ محلِ معرفت و محبتِ حق است،
غیرِ ایں بدن ست۔

دلیلِ پنجم: آں کہ خاصیتِ عالمِ اجسام آنست کہ بر لوحے کہ در وے نقشے نوشتہ شود، آں لوح
نقشے دیگر قبول نکند؛ و اگر دو نقش بر لوحے نگاشتہ شود، ہر دو بیک دیگر آمیختہ شوند و ہر دو باطل
گردد۔ بخلافِ لوحِ نقشِ انسانی کہ ہر چند نقشِ علوم و معارف دراں نگاشتہ شود ہیچ یک از آنہا بدیگرے
آمیختہ نشود و باطل نگردد، زیرا کہ مرد باشد کہ از بیست علم از ہر یک. بورا مجلدہا یاد باشد و با ایں ہمہ
صورتِ جملہ آسمانہا و سیرِ سیارگان و صورتِ دریا و کوہہا و شہرہا در خاطرِ او باشد و احوال و صفاتِ
معادن و نبات و حیوان در خاطرِ او جمع شدہ باشد و ایں ہمہ نقشہا صافی باشد، و ہیچ یک از آنہا
بدیگرے آمیختہ نمیشود۔ پس پیدا شد کہ ہر چہ جسم بود، جز یک نقش قبول نکند و روحِ انسانی نقشہائے
بے غایت و صورتہائے بے نہایت قبول می کند، و ہیچ یک از انہا بدیگرے آمیختہ نمی شود۔ پس
معلوم شد کہ جوہرِ روحِ دانا چیزے دیگر ست، غیرِ جسمِ ظلمانیِ پُر کدورت۔

دلیلِ ششم: آنست کہ مرتبہائے عمرِ آدمی چہار ست؛ اول زیادہ شدن و آنرا سنِ نشو و نما
گویند و غایتِ آں تا سی سال باشد۔ دوم، استادن کہ نہ زیادہ شود و نہ نقصان پذیرد، و آں را سنِ
شباب گویند؛ و غایتِ آں تا چہل سال باشد۔ سوئم، نقصانِ اندک۔ مردم دریں مدت کہل
باشند؛ و غایتِ آں تا شصت سال بود۔ چہارم، نقصانِ بسیار، و مردم دریں اوقات مردِ
ضعیف باشند؛ و غایتِ آں مرگ باشد۔ و عاقلاں گفتہ اند کہ آدمی در وقتِ نشو و نما چوں بہار
ست؛ طبعِ او گرم و تر باشد؛ و در جوانی چوں تابستان ست طبعش گرم خشک بود؛ و در کہولت
چوں خزاں باشد سرد و خشک؛ و در پیری چوں زمستاں شود سرد و تر۔ چوں ایں مقدمہ معلوم
شد، گوئیم، مرد چوں بچہل رسد، تن و جسدِ او در نقصان و ضعف افتد۔ لیکن کمالِ عقلِ او دریں
وقت پیدا شود ازیں جہت ست کہ سرورِ کائنات و مفخرِ موجودات علیہ افضل الصلوٰۃ و التسلیمات
بعد از چہل سال بخلعتِ وحی سرفراز گشت۔ پس معلوم شد کہ کارِ عالمِ روحانی برخلافِ کارِ عالمِ

جسمانی ست . و ہر چہ موجبِ ضعف و نقصانِ یکے ست ، کمال و سعادتِ دیگرے می شود .

دلیل ھفتم : کسانیکہ در دریاے معرفت غوص کنند ، و دلِ ایشاں لذتِ معرفت و محبتِ حق دریابد ، و بر قبائح و فضائحِ عالمِ جسمانی وقوفِ شاں افتد ، در آں وقت از خوردن و خفتن باز مانند و باشد کہ روزہا بگزرد و اندک طعامے خورند . پس معلوم شد کہ عالمِ روحانی دیگر ست و عالمِ جسمانی دیگر .

دلیل ھشتم : عقلِ ہمہ کس گواہی می دہد کہ عالمِ جسمانی خسیس ست و عالمِ روحانی شریف و نفیس زیرا کہ ہرگاہ کہ در بارۂ شخص اعتقادے دارند کہ او را بخوردن و خفتن و شہوت راندن رغبتے نیست و از طلبِ ایں معانی دور است ، جملہ خلائق او را خدمت کنند و فرمانبرداری نمایند . و ہرگاہ کہ در شانِ شخصے اعتقادے دارند کہ ہمگی رغبتِ او در خفتن و خوردن و شہوت راندن است ، ہمہ کس او را بچشمِ حقارت بینند و او را از بہائم دانند . پس معلوم شد کہ ہمہ عقلہا گواہی می دہند کہ ہر چہ تعلق بسعادتِ تن دارد ، شقاوت و عینِ نقصان ست و سعادت و کمالِ حقیقی جز سعادت و کمالاتِ روحانی نیست .

دلیل نہم : آنکہ حقیقتِ آدمی چیزیست کہ دانا و گویا و متذکر و متفکر باشد و ایں ہمہ صفات در وے جمع آید و در تن ہیچ عضوے نیست کہ ایں ہمہ صفات در وے جمع باشد ، زیرا چشم بینائی دارد ، اما شنوائی و گویائی و دانائی ندارد ؛ و زبان گویائی دارد ، و دیگر صفتہا ندارد ؛ و دماغ تفکر و تخیل دارد ، اما بینائی و شنوائی ندارد ؛ و دل دانائی دارد ، اما دیگر صفتہا ندارد . پس پیدا شد کہ ہیچ عضوے در تن نیست کہ ایں صفتہا در وے جمع شدہ . پس معلوم شد کہ حقیقتِ آدمی چیزے دیگر ست غیرِ ایں اعضا و اجزا .

دلیل دھم : آنست کہ ہمہ اعضا ملکِ انسان است . خداے تعالیٰ در صفتِ کافراں فرمودہ : لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا یعنی ایشاں را دلیست کہ بداں دل ہیچ فہم نکنند ، وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا ، ایشاں را چشمہا ست کہ بداں ہیچ نہ بینند کہ ایں ہمہ اعضا ملکِ انسان ست . و عقلا نیز چنیں می گویند چنانکہ گویند : "دلِ من ، و چشمِ من ، و گوشِ من ، و دست و پاے من ، و عقلِ من" . پس معلوم شد کہ ایں ہمہ اعضا ملکِ انسان است و ہر آئینہ مالک غیرِ مملوک باشد پس پیدا شد کہ حقیقتِ انسان چیزے دیگر ست ، غیرِ ایں تنِ ظلمانی و اجزاے جسمانی .

دلیل یازدهم: آنکه تن آدمی از خون و صفرا و بلغم و سودا پدید آمده است، و این همه پلید و تاریک و کثیف اند و معرفت و محبتِ حق جل و علا نورِ همه نورهاست، و پاک و مطهر و از آلایش مبرّا و مقدس پس ممکن نباشد که محلِ نورِ همه نورها اجسامِ پلید و کثیف باشد. پس معلوم شد که محلِ معرفت و محبتِ باری تعالی از بدن خارج است.

سوال: اگر سائلے گوید "چوں می گوئی که روحِ انسانی و نفسِ ناطقه چیزے دگر است غیر تن، پس همانا جزو لیست از خداے عزّ و جل" جواب گوئیم: "حاشا و کلّا این گمانے باطل است. چه این کسے می پندارد که آفریده هاے خداے تعالی غیر ازیں اجسامِ تاریک [و] کثیف نیست و این خطاے بزرگ است؛ بلکه آفریده هاے خداے تعالی دو قسم اند، یکے عالمِ اجسام و اشرفِ مراتبِ آں عرش است، پس کرسی، پس اطباقِ سماوات، بعد ازاں هیئتِ انسان، آں گاه حیوان، آں گاه نبات، آں گاه جماد. قسمِ دوم عالمِ ارواح و اشرفِ آں ملائکه اند که حاملانِ عرشِ پروردگار اند وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ ۝ آں گاه آں ملائکه که گردِ عرش فرو گرفته اند وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ و هم چنیں بترتیب فرو می آید تا بارواحِ انسانی. پس معلوم شد که هم عالمِ اجسام و هم عالمِ ارواح مخلوق و پدید آورده آفریدگار اند، و ذاتِ قدیمِ بے نهایت حق جل و علا از جزو و بعض و قسمت مقدس و منزه است لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ و دریں مقام اندکے از حقیقتِ روحِ انسانی معلوم شد، والله الهادی.

فصلِ چهارم

در حقیقتِ مرگ و احوالِ آن

چوں حقیقتِ روح معلوم شد، بحقیقتِ مرگ باز آئیم. پس گوئیم: درست کردیم بدلیلهاے روشن که جوهرِ روحِ انسانی در هستیِ خویش مستغنی ست از وجودِ ایں جسد، و ایں جسد اورا آلتے هست که بوسیله آں اسبابِ سعادت کسب کند. لیکن روح چوں فاعلے باشد و او را در بعضے احوال آلتے بود که اگر آں آلت شکسته شود، ذاتِ فاعل باطل شود، بلکه از کار کردن باز ماند، و هم چنیں خون که آلتِ نفسِ ناطقه ست، فاسد گردد؛ در ذاتِ نفس تغیّرے و قصورے پدید نیاید، بلکه ذاتِ او بحالِ خود باقی باشد.

الاّ آنکه اگر بدیں آلت دوستی عالمِ آخرت حاصل کردہ باشد، چوں نفس از دار دشمن خلاص یافت و بدُوست رسید، لاجرم او را سعادت بر سعادت حاصل باشد۔ و اگر بداں آلت دوستی دنیا و مال و جاہ و لذات و شہواتِ جسمانی حاصل کردہ باشد، چوں بمیرد از دوست دُور ماند و در شہرِ غریبستان بے یار و بیکس گرفتار شود۔ لاجرم غم بر غمش بیفزاید۔ و بر عاقلے کہ دریں فصل تأمل کند و توفیق ربانی ہمراہ او شود، واقعۂ حال خود را بعد از مرگ دریں زندگانی معلوم کند و حقیقت آں را بذوق دریابد۔ وَاللّٰہُ یَہْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ؏

فصل پنجم

درحقیقتِ دردِ فراق

بداں کہ حقیقتِ دردِ فراق جدا ماندنِ کسے ست از چیزے کہ دوست دارد۔ پس از وے جدا ماندن درد باشد۔ مثلاً ہیچ دردِ سخت تر از دردِ آتش سوختن نیست۔ زیرا کہ طبیعت ہر جزو از اجزائے تن تقاضائے آں کند کہ بجزو دیگر پیوستہ باشد و آں پیوستگی معشوق و محبوب اوست، و آتش چیزے گرم و لطیف ست بمیانِ اجزا در آید و آں را از یک دیگر جدا گرداند۔ پس دردے کہ پدید آید بسبب تفرق اجزائے بدن از یک دیگر باشد۔ پس معلوم شد کہ دردِ سوختن آتش دردِ جدائی است و بداں کہ زخمِ تیغ در ہمہ اعضا جدائی پدید نیارد۔ امّا آتش در ہمہ اعضا جدائی پدید آرد۔ لاجرم دردے کہ از تیغ باشد سہل تر بود۔ پس معلوم شد حقیقتِ درد جدا ماندن ست از دوست۔ واللہ تعالیٰ اعلم

فصلِ ششم

دربیان نصیحت و تنبیہ

چوں معلوم شد کہ حقیقتِ درد جدا ماندنست از دوست، پس باید کہ مردِ عاقل بکوشد تا ہر چہ خطرِ آں دارد کہ از وے جدا ماند، آں را دوست ندارد۔ پس بنا بریں دوست داشتنِ زن و فرزند خطر است، زیرا کہ شاید کہ نماند، و دردِ مفارقت آں بماند۔ و ہم چنیں تمام امورِ دنیوی از پادشاہی و حکومت و جاہ و مال و سائر شہوات و لذات جسمانی بلکہ بدن و اجزائے آں، زیرا کہ

اینہا ہمہ بمرگ ازو جدا خواہند شد ؛ و چوں جدائی پدید آید، درد ظاہر شود ۔ رباعی

چیزے کہ نہ روے سود بقا باشی ازو — آخر ہدف تیر بلا باشی ازو
از ہر چہ بمیرد جدا باشی ازو (کذا) — آں بہ کہ بزندگی جدا باشی ازو

و بداں کہ اندازۂ قوت و شدتِ درد بحسبِ اندازۂ قوت و شدتِ محبت باشد۔ ہر چند محبتِ چیزے بیشتر، درد جدائی ازو سخت تر۔ امّا آنچہ ازوے جدائی ممکن نیست، معرفت و محبت پروردگار است تعالیٰ شانہ، زیرا کہ ذاتِ حق جل جلالہٗ از فنا و عدم منزّہ است و جوہر روح ہرگز نیست نشود ؛ و بسبب فساد و خرابیِ تن فاسد و متغیر نگردد۔ و پس ہر کس کہ دوستی حق اختیار نماید، ہرگز از دوست خود جدا نگردد و بدردِ جدائی ازو مبتلا نشود ۔ لاجرم ہرگز اورا غم و اندوہ نباشد "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" ونعم ما قال الشاعر المحقق فی ذالک المعنی۔ رباعی

ہر صورتِ زیبا کہ ترا روے نمود — خواہد فلک از چشمِ تو روزیش ربود
رَو، دل بکسے دہ کہ در اطوارِ وجود — بودست ہمیشہ با تو و خواہد بود

واللہ الموفق والمعین !

فصلِ ہفتم

در بیانِ مراتبِ ارواحِ انسانی

بداں کہ مراتب ارواح بشری سہ است : اصحابِ سعادت، اصحابِ سلامت و ارباب شقاوت۔ و در قرآن مجید وصفِ اصحابِ سعادت اینست "وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ" و در حساب سعادتِ انسان سہ چیز فرمودہ ۔ اول روح، دوم ریحان سوم جنتِ نعیم، پس بباید کوشید تا معلوم شود کہ روح و ریحان کہ مقدم اند بر جنتِ نعیم، کہ اند حقیقت آں جز مقربان را معلوم نشود و خدمتگاران درگاہِ سلطانِ صاحب قرآن را بقدر خدمت و قوفے حاصل شود۔ و امّا اصحابِ سلامت وصفت ایشان این است : "وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ" و اصحاب شقاوت

را حال این: وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ فَنُزُلٌ مِنْ حَمِيمٍ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ[۱۳]
بداں، کہ دریں آیات اسرار بسیار است کہ جز جانِ صدیقاں محرم آں نباشد و آں را در قلم
آوردن و در کاغذ نوشتن روا نباشد و حکایتِ آں حالت ایں باشد: وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ
يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ[۱۴] لیکن ما از برائے راہ
نمودن مثالے بیان کنیم تا درِ آں تحقیقت کشودہ شود۔

بداں کہ اکثرِ اجزائے کوہہا و خاکہا ہمہ خاکِ تیرہ باشد و در آں ہیچ جزوے از اجزائے
زر یافت نشود و بعض کوہہا و خاکہا بود کہ اجزائے زر با آں آمیختہ باشد لیکن آں قسم خاک و سنگ
کہ در وے ہیچ زر نباشد، بیشتر بود، از آنچہ زر در وے یافت شود، بلکہ غالب اجزائے عالم آں
باشد کہ در وے ہیچ زر یافت نشود۔ و آں قسم کہ اجزائے زر با آں آمیختہ است متفاوت باشد،
زیرا کہ گاہ باشد ...[۱۵] و ہمچنیں زیادہ می شود تا بہ ہمانجم (؟) رسد کہ اجزائے زر بدست تواں
گرفت؛ بلکہ شاید غارے پیدا شود پُر از زرِ سرخِ خالص۔ اما ایں بغایت نادر بود و در ادوار و
اعصار بیش از یک بار پیدا نشود و چوں مثالِ ایں پیدا شد، بداں کہ ارواحِ انسانی نسبت بامعرفت
و محبتِ الٰہی ہمیں حکم دارد، چہ اکثر ارواحِ اہلِ عالم از آمیختگی با معرفت و محبت حق سبحانہٗ و تعالیٰ
خالی باشند و اکثرِ آنہا کہ دعویٰ آں کنند، از راہِ تقلید باشد و رعایت مصالح دنیوی و بحقیقت
روح ایشاں را از آں نہ نصیبے باشد و نہ نصابے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اما بعضے باشند کہ جوہرِ روحِ
ایشاں را با معرفتِ حق تعالےٰ مناسبتے و با محبتِ او آشنائی باشد ...[۱۶]

از دیدہ قدم بر سرِ جاں بنہادند ... تا یک دلِ دیوانہ بدست آوردند

و ہمچناں کہ خاکے کہ با او اجزائے زر آمیختہ باشد، مراتب بسیار دارد، تا بحدے رسد کہ جملہ غار پُر از
زرِ خالص باشد، ہمچنیں مراتب ارواحِ بشری مختلف و بسیار ست، تا بحدے رسد کہ جملگی روح غرقِ محبت
و معرفت و طاعت حق سبحانہ و تعالیٰ باشد، سخن او از حق و ذکرِ او از فضلِ حق باشد و فکرِ او در آلاو
نعمائے حق باشد و اعتماد او بر کرمِ حق باشد۔ چوں بلا بیند، گوید: الضَّارُّ هُوَ؛ چوں آلا بیند، گوید:
النَّافِعُ هُوَ۔ اگر کائنات خود را بر وے عرضہ کنند، در ہیچ ننگرد، و گوید: لَا هُوَ إِلَّا هُوَ۔ و بداں کہ ہمچناں
کہ غارے پُر از زر باشد، کس نشانِ او نشناسد، و جائے او ندانند، و کسے کہ آں را داند و جائے

آں شناسد، کس را از اں خبر ندہد و نشان آں با کسے درمیاں نہ نہد، ہمچنیں آن روح کہ غرق معرفت و محبتِ حق باشد، کس اُو را نشناسد و جاے او ندانند و نشان آں معنی کسے بر وے نہ بیند و بے نام و نشان و بے سر و سامان میرو۔ اولیائی تحت قبائی لا یعرفهم غیری۔ شعر

لله تحت قباب العز طائفة　　اخفاهم عن عيون الناس اجلالا

هم السلاطين فى اطمار مسكنة　　جرّوا على القلة الخضراء اذيالا

رباعی

زاں مے خوردم کہ روح پیمانۂ اوست　　زو مست شدم کہ عقل دیوانۂ اوست

درد ے ....!

الهى الهى نور قلوبنا بانوار معرفتك واغرقنا فى بحار شوقك ومحبتك انك على كل شىء قدير۔

فصل ہشتم

در بیان حکمت مرگ و دلائلِ آں

بداں کہ مرگ فعلِ حق است، تعالیٰ شانہٗ۔ چنانچہ فرمود: وَالَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ[١٨]۔ و فعل حق عبث و باطل نباشد۔ بلکہ در مرگ حکمتہاے بسیار است۔

حکمت اوّل آنست کہ آدمی را سرمایۂ عقل دادند و بباز رگانی بایں عالم فرستادند۔ پس چوں بایں عالم آمد، بازرگانی کرد و سود او را کہ معارفِ الٰہی و حقائق نامتناہی کسب کرد۔ اگر ہمچناں در غربت بماند روا نبود، و مصلحت آں باشد کہ بوطن اصلی خود باز گردد۔ چنانچہ فرمود: ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً[١٩]

حکمت دوم آنست کہ اگر من ہمیشہ زندہ بمانم، دیگراں را جاے نماند و لائق حکیم نیست کہ یکے را ہمہ دہد و دیگر را ہیچ ندہد، پس حکمت مقتضی آنست کہ چوں یکے در آمد و از مائدۂ رحمت نصیب یافت، برخیزد۔ تا دیگرے بجاے او نشیند و نصیب یابد۔ فرد:

زیں مائدۂ جہاں چہ خوردی و شکست (؟)　　برخیز کہ دیگراں بخواہند نشست

حکمت سوم آنکہ لذتِ جسمانی بس مختصر ست و مکدر۔ حاصل کار بیش ازیں نیست کہ چاشتگاہ

خوانے پیش او نہند و نماز بہ پیشیں کوزہ، و شمع ہنگام مثل ایں و جماعتے را می بیند و با ایشاں دروغے می گوید و بنفاق و ریا بسر می برند۔ حاصلِ کار حیاتِ جسمانی ایں ست کہ اگر عمر یک سال باشد، این ست و اگر صد سال ہمیں، و غافل چوں باز نگرد، ضائع کردنِ عمر باشد و چوں لذات و شہوات عالم مختصر و محقر ست و با وجود مختصرے جہل (؟)، و مکدر، لائق حکیم نباشد، آدمی مادر، و ے گذاشتن و اما سعادتِ آخرت ففیہا لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ پس ہر آئینہ مرگ از واجبات باشد، تا روح از مضیق ایں عالم خسیس خلاص [شود] و بفضائے عالمِ باقی نفیس رسد۔ شعر:

اقتلونی اقتلونی یا ثقات　　　ان فی قتلی حیاۃً فی حیاۃ[۲۰]

حکمت چہارم آنست کہ فرزند آں وقت کہ در شکم مادر بودہ ہنوز از خوشیِ ایں عالم خبر نداشت و ورا ناخوش می آمد از آں موضع جدا شدن۔ پس حکمتِ الٰہی تقاضا کرد کہ ورا باکراہ از آں جدا کرد و دریں عالم در آورد۔ ولیکن چوں بدیں عالم رسید، معلوم کرد کہ ایں عالم بہتر و شریف تر از آں موضع تنگ و تاریک [است] ہم بریں قیاس چوں آدمی را خواہند کہ ازیں عالمِ ظلمانی بیروں برند، او را ناخوش آید۔ لیکن چوں بداں عالم رسد، او را معلوم شود کہ آں عالم نورانی و بہتر ازیں عالم ست وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ[۲۱]۔

حکمت پنجم نفسِ ناطقہ، سعادت آں باشد کہ بحضرتِ کبریا رسد و از تنگنائے عالمِ ظلمانی بہ بالائے عالمِ نورانی بر آید۔ لیکن او را آمدن بخود میسر نشود۔ او را بر مرکب تن سوار کردند، او بدیں مرکب باقدامِ طاعت و عبادات بدر سرائے پردۂ قُلِ اللّٰہ برسید۔ اگر دریں وقت ہمچناں بر پشت ستور بماند، از دیدار شاہ محروم شود۔ پس اولیٰ آں باشد کہ از پشتِ ستور فرود آید و ترک او بگوید، و بحضرتِ عزت رسد، در مجلس فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ[۲۲] بنشیند

حکمت ششم کودکے کہ بعلم خواندن از وطن خود جدا شود و بغربت افتاد و در علم کامل شد، اہلِ او از کار او خبر یافتند، از برائے او قضا و خطابت[۲۳] آمادہ کردند و مہمان خانہائے زیبا بیاد استند و ہمہ منتظر او شدند۔ اگر او ہمچناں در غربت قرار گیرد و خود را از آں ہمہ خیرات محروم کردہ باشد[۲۴] پس مصلحت آں باشد کہ از آں غربت بوطن باز شود و با یاران و برادرانِ خود دراں موضع بنشیند

پس بریں قیاس متعلم روح از عالم روحانی بغربت آمد و در عالم جسمانی علم و معرفت و محبت حق تعالیٰ حاصل کرد۔ برادران اُولٰئِكَ [مَعَ] الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ[۲۵] مهمان خانهاے اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ[۲۶] آراسته کرده۔ اولیٰ آں بود که از غربت رو بوطنِ اصلی آورد و بدرگاهِ پادشاه ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ[۲۷] رو آرد و خود را ازاں غمومِ غربت خلاص دہد۔

حکمتِ ہفتم آدمیِ کامل مادام که در حیاتِ جسمانی ست، ہمنشیں دیواں باشد و بعد از مرگ ہمنشینِ فرشتگان۔ ببیں که کدام بہتر ست!

حکمتِ ہشتم برہان گفتیم که روحِ آدمی از جنس عالم ارواح است و جسد و جثهٔ او از عالم اجسام و جنس باجنس اولیٰ باشد، و مرگ جز ایں نیست که روح از جسم جدا شود و باطائفهٔ روحانیان و مقربانِ ہمنشیں گردد۔

حکمت نہم اگر حیاتِ جسمانی باقی بودے، نوبت از پدر بفرزند نرسیدے۔ پس گزشتن نوبت او آمدنِ نوبتِ ایں باشد۔ و ہرچه بابودِ او سبب بودِ او باشد، عاقبت نابودِ او بربودِ او غالب باشد۔ لاجرم كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ[۲۸] غالب باشد۔

حکمت دہم بنده در حیات جسمانی باحق در شہود و حضور و از خلق محجوب، و ہرآئینه کشف و تجلیِ نور حق تعالیٰ بہتر باشد۔ و وجوهِ حکمت بسیار است، حالیا برہمیں اختصار رفت۔

سوال: اگر کسے سوال کند که ایں حکمتہا که باز نمودی در مردن نیکاں و صالحاں راست ...، حکمتِ مرگِ بداں و فاسقاں چیست؟

جواب: گویم منقطع شدن شرِ ایشاں از خلق عالم واللّٰه اعلم باسرار الحکمت وهو الحكيم الحاكمين

فصل نہم

در حقیقتِ زیارت و کیفیت تجلّی ارواح

اگر سائلے گوید که مرا بیان کن فائدهٔ زیارت گزشتگاں چیست۔ تعلقِ روح ببدنِ

تعلقِ عشقی است و سخن در حقیقت ایں عشق سخت باریک ست و جز مقربانِ حضرت را ازاں خبر نیست ۔ ولیکن وجود ایں عشق سخت ظاہر ست، زیراکہ جملہ حیوانات بالطبع از مرگ گریزانند ۔ پس چوں روح از تن جدا شد، بعد از جدائی آں روح باایں تن تعلقے قوی ماند ۔ چوں شخصے دیگر بزیارت آں خاک حاضر شود، روح آں زیارت کنندہ را با روح جدا شدہ آمیختگی و نزدیکی بسببِ آں خاک حاصل شود وایں دو روح چوں دو آئینہ شوند، برابرِ یک دیگر بداشتہ؛ وبسبب ایں تعلق ہر چہ دریں روح باشد، در آں روحِ دیگر پدید آید؛ وہر چہ درآں باشد دریں ۔ وہر دو بسببِ یکدیگر روشن شوند ۔ بباید دانست کہ روحِ مردِ زیارت کنندہ را قوتِ کسب زیادتی علم ہست وروح جدا شدہ را قوتِ تجلی، ولیکن قوتِ کسب ندارد ۔ چوں ہر دو روح بواسطۂ آں خاک در برابرِ یک دیگر افتادند، قوتِ تجلیِ روحِ جدا شدہ برتنِ مردِ زیارت کنندہ افتد واز وَے اثرے یابد، وآں تجلی روح وَے قوت گیرد ۔ واز روحِ زیارت کنندہ اثرِ معرفتِ زیارت وطاعت وعبادت بروحِ جدا شدہ رسد وسببِ مزید درجات اُو گردد ۔ وایں سخن از اسرارِ غیب است وبطریقِ قیاس معلوم شود ۔ اما کیفیتِ تجلی ارواح ومخاطباتِ ایشاں از راہِ مکاشفہ معلوم شود ۔ رزقنا اللہ بفضلہٖ ۔

فصلِ دہم

در ذکرِ احوالِ خویش وحکایتِ دردِ عزا وختمِ کتاب

فرزند محمد افاض اللہ علیہ اضعاف الرحمۃ والرضوان ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہر چہ ازیں ضعیف در حسابِ حمیت وبشریت ست، در تنورِ سوزانست؛ وہر چہ در حسابِ صفوت وملکیت، نصیبِ او رَوح وریحان ست ۔ ابو جعفر منصور را پسرے وفات یافت، ابو حنیفہ کوفی بدیں سخن خرسند شد واز عزا بیروں آمد بیقین دانم کہ رحمت خدا باآں مرحوم بیش از شفقتِ من است، زیراکہ ہر شفقت کہ در دلِ من باشد، آں شفقتِ آفریدۂ

حق است۔ پس اگر از پیش رحمتِ حق نبودے، در دلِ خلق شفقت کے بودے۔ او بندۂ ضعیف و حضرتِ ذوالجلال پروردگارِ کریم۔ امید می دارم کہ او را آنجا بہتر کہ مارا اینجا۔ یا کٓھٰیٰعٓصٓ ، یا حٰمٓعٓسٓقٓ یا ھو من لاھو الا ھو یا من لا الٰہ الا ھو یا غالبا علی الدھر والمکان ، یا غنیًا من الحدث والامکان۔ افض علینا و علی ذالک الضعیف سجال الرحمۃ والرضوان ، انک انت الملک الدیان حاصل ، چشمے دارم گریاں و دلے از آتشِ درد فراق بریاں و جانے بجگرہا ے خداوند جہان واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

تمام شد

حواشی

۱۔ اصل میں 'انداخت' ہی ہے، لیکن سیاق سے یہاں 'انداختند' چاہیے۔

۲۔ یہ محل 'مانند' کا ہے۔

۳۔ الاعراف ۷: ۱۷۹۔

۴۔ ایضاً

۵۔ الحاقہ ۶۹: ۱۷

۶۔ الزمر ۳۹: ۷۵

۷۔ الشوریٰ ۴۲: ۱۱۔

۸۔ البقرۃ ۲: ۲۱۳۔

۹۔ النور ۲۴: ۴۰۔

۱۰۔ یونس ۱۰: ۶۲

۱۱۔ الواقعۃ ۵۶: ۸۸۔۸۹

۱۲۔ ایضاً ۹۰۔۹۱

۱۳۔ ایضاً ۹۲۔۹۳

۱۴۔ آل عمران ۳: ۷

۱۵۔ یہاں سے جلدبندی میں ایک سطر کٹ گئی ہے۔

۱۶۔ ظاہراً یہاں ایک سے زیادہ سطریں ضائع ہوگئی ہیں۔

۱۷۔ یہاں سے بھی ایک سطر (دوسرا شعر) جلدبندی میں کٹ گئی ہے۔

۱۸۔ الملک ۶۷: ۲

۱۹۔ الفجر ۸۹: ۲۸

۲۰۔ مثنوی مولانا روم، دفتر ۳ ص ۲۲۹

۲۱۔ العنکبوت ۲۹: ۶۴

۲۲۔ القمر ۵۴: ۵۵

۲۳۔ مخطوطے میں یہ لفظ صاف نہیں؛ تصحیح قیاسی ہے۔

۲۴۔ ظاہراً یہاں کچھ عبارت لکھنے سے رہ گئی ہے۔

۲۵۔ النساء ۴: ۶۹

۲۶۔ الحجر ۱۵: ۴۷

۲۷۔ الانعام ۶: ۶۲

۲۸۔ الرحمن ۵۵: ۲۶

۲۹۔ اصل میں یہی ہے۔ لیکن یہ محل روحانی کا ہے۔

ہندوستان کی شرعی حیثیت

ہندوستان کی شرعی حیثیت

"ہندوستان اور دارالحرب کے نام سے دارالاشاعت رحمانی مونگیر (بہار) کی طرف سے اعلیٰ کاغذ پر اور عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ بڑے سائز پر سات صفحے کا ایک رسالہ شائع ہوا ہے جو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی ایک تحریر پر مشتمل ہے۔ اس تحریر میں ہندوستان کے متعلق دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ اصل تحریر فارسی میں ہے۔ اس پر اردو میں مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری امیر شریعت بہار نے ڈیڑھ صفحہ کی جو تقریب لکھی ہے اس میں انھوں نے اس کی روداد لکھی ہے کہ یہ تحریر خانقاہ رحمانیہ تک کیوں کر پہونچی اور پھر جزم و یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ اس تحریر کے مصنف (صرف کاتب یا ناقل نہیں) حضرت شاہ صاحب ہی ہیں اور اس بنا پر یہ فتویٰ شاہ صاحب کا ہی ہے۔ امیر شریعت بہار نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لگے ہاتھوں موجودہ ہندوستان کی نسبت بھی اپنے عندیہ کا اظہار کر دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"ظاہر ہے حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریباً چالیس برس پہلے کی ہے جب کہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا، اس تحریر میں دارالحرب کے لیے جو اصل بنیاد بتلائی گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جا سکتی ہے۔"

اس بنا پر اس موضوع پر ہماری گفتگو کے دو جزء ہوں گے۔ پہلے جزء میں گفتگو زیرِ بحث تحریر و رسالہ سے متعلق ہوگی اور دوسرے جزء میں موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق۔

شاہ صاحب کی طرف اس تحریر کا انتساب غلط ہے

ہم خود حضرت الاستاذ کے خط سے آشنا ہیں اور آپ کے متعدد خطوط اور تحریریں ہمارے پاس محفوظ بھی تھیں جو ۷۱ء کے ہنگامہ میں گھر کے سب سامان کے ساتھ لٹ گئیں۔ اس بنار پر اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ تحریر لکھی ہوئی حضرت الاستاذ کے ہاتھ کی ہی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت الاستاذ اس کے صرف ناقل ہیں مصنف نہیں، کاتب ہیں، صاحب تحریر نہیں۔ اس بنا پر اس تحریر میں جو کچھ درج ہے اس کو شاہ صاحب کی رائے یا فتویٰ قرار دینا قطعاً غلط ہے۔ چنانچہ اتنی بات تو مولانا منت اللہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ تحریر شاہ صاحب کے مسودات میں ملی ہے اور اس پر شاہ صاحب کے دستخط نہیں ہیں۔

کیا یہ فتویٰ حضرت گنگوہی کا ہے

اصل یہ ہے کہ اب سے کم و بیش ہنتالیس برس پہلے یعنی ۱۳۵۲ھ میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی نے مکتبۂ دار التبلیغ دیوبند ضلع سہارنپور کی طرف سے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عربی نام "فیصلۃ الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام" اور اردو نام "کیا ہندوستان دار الحرب ہے" تھا، مفتی صاحب اس رسالہ کے تعارف میں لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیر بحث چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آج قطب عالم جنید زمان ابو حنیفۂ وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ فتویٰ شائع کیا جاتا ہے جو آپ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق بعض اہل علم تلامذہ کے سوال کے جواب میں مفصل و مکمل تحریر فرمایا ہے اور جس کی نقل حضرتِ ممدوح کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد صاحبؒ نے احقر کو عطا فرمائی تھی اور حضرت کے اقارب و تلامذہ میں دوسرے متعدد حضرات کے پاس بھی اس کی نقلیں موجود ہیں۔"

علاوہ ازیں ہمارے شعبۂ دینیات کے لکچرر قاری محمد رضوان اللہ جن کو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ پر ایک ضخیم تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اسی سال پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب ان کو ایک خط مورخہ ۱۷ ارمحرم الحرام ۸۳ھ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں قدیم زمانۂ طالب علمی سے سنتا تھا کہ حضرت گنگوہی کا کوئی فتویٰ اس سلسلہ میں مفصل ہے۔ پھر عرصہ دراز کے بعد میں گنگوہ گیا تو حضرتِ گنگوہی کے مسودات میں مجھے

یہ فتویٰ ملا اور میں نے اسے حکیم مسعود احمد صاحب سے مانگ لیا جو آپ نے عنایت فرمادیا۔ میں نے اردو ترجمہ کے ساتھ اس کو شائع کردیا۔"

جناب مفتی صاحب نے اس فتوی کو اس طرح شائع کیا ہے کہ اوپر اصل متن فارسی میں ہے اس کے نیچے خود مفتی صاحب کے قلم سے اردو ترجمہ ہے اور ادھر اُدھر جو حواشی ہیں وہ مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے لکھے ہیں جو اس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے اب آپ حضرت شاہ صاحب کی تحریر کو حضرت گنگوہی کی تحریر کے ساتھ ملا کر پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ اول الذکر موخر الذکر کی حرف بحرف نقل ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ فتویٰ کے ناقل چونکہ حضرت شاہ صاحب خود ہیں اس لئے املا اور کتابت کے اغلاط سے یہ تحریر بالکل پاک و صاف ہے اور مفتی صاحب کے شائع کردہ رسالہ میں متعدد غلطیاں تصحیح سے رہ گئی ہیں۔ علاوہ بریں حضرت شاہ صاحب نے اس کو نقل کرتے وقت اصل عبارت میں جو بعض جملے مکرر یا غیر ضروری تھے ان کو حذف کردیا ہے۔ اس معمولی فرق کے علاوہ دونوں تحریریں من وعن ایک ہیں، اس بنا پر جیسا کہ مفتی صاحب نے لکھا بھی ہے جہاں حضرت گنگوہی کے متعدد اقارب و تلامذہ کے پاس حضرت کے اس فتوی کی نقول موجود تھیں ایک نقل حضرت شاہ صاحب کے پاس بھی تھی اور اس کو ہی خود حضرت شاہ صاحب کی تحریر سمجھ کر آپ کی طرف منسوب کرکے چھاپ دیا گیا ہے۔

ہندوستان کے متعلق حضرت شاہ صاحب کی رائے

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ زیر تبصرہ فتویٰ حضرت شاہ صاحب کا ہرگز نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ خود حضرت شاہ صاحب کا اس بارہ میں خیال کیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے نزدیک ہندوستان دارالحرب نہیں بلکہ دارالامان بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ فقہا کی اصطلاح میں (جس پر بحث آگے آرہی ہے)، دارالعہد تھا۔ چنانچہ دسمبر ۲۷ء میں پشاور کی جمعیۃ علمائے ہند کی عظیم الشان سالانہ کانفرنس میں بحیثیت صدر کے آپ نے جو ایک نہایت معرکۃ آرا خطبہ صدارت فارسی زبان میں پڑھا تھا اس میں اس کا ذکر کیا ہے اور ہندوستان کی اس وقت کی پوزیشن کا مقابلہ اس وقت سے کیا ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود مدینہ کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

"ملکِ ما اگرچہ ہست دارالامان ست وما سکونت اندران داریم۔ باید کہ احکامِ ایں دار از کتبِ مذہب تلاش کنیم۔ استیعاب آن ایں وقت ممکن نیست البتہ جملۂ چند از معاہدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم با یہودِ مدینہ در ابتدا ہجرت از سیرت ابن ہشام نقل می کنم کہ نمونہ از نوعیت معاہدہ با غیر مسلم در غیر دار اسلام معلوم شود۔"[1]

شاہ صاحب ہندوستان کو دارالعہد مانتے تھے اسی وجہ سے پشاور کے مذکورۂ بالا اجلاس میں حکومت ہند سے محکمۂ قضا کے قیام کا مطالبہ کیا گیا اور اس سلسلہ میں جو تجویز منظور ہوئی تھی اس میں محکمہ سے متعلق یہ الفاظ بھی تھے "جو بحسب معاہدۂ حکومت ہمارا شرعی حق ہے"[2]۔

حضرت گنگوہی کا ایک اور مطبوعہ فتویٰ اب آیئے اصل تحریر پر گفتگو کریں۔ جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے جزم ویقین کے ساتھ بیان کیا اور لکھا ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے تو قطع نظر اس بات کے کہ اس تحریر پر حضرت گنگوہی کے دستخط نہیں ہیں اور یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مسودات میں مفتی صاحب کو اسی طرح ملی تھی جس طرح مولانا منت اللہ کو شاہ صاحب کے مسودات میں دستیاب ہوئی تھی۔ ایک بڑا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اس تحریر میں حضرت گنگوہی نے پوری قوت وصراحت کے ساتھ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ہے۔ لیکن اور فتویٰ جو مطبوعہ ہے اور جس پر آپ کے دستخط اور مہر بھی ہے وہ فتویٰ اوّل کی تردید کرتا ہے چنانچہ ایک شخص نے سوال کیا "ہند دارالحرب ہے یا نہیں"؟ اس کے جواب میں فرمایا:۔

"ہند کے دارالحرب ہونے میں اختلاف علماء کا ہے۔ بظاہر تحقیقِ حال بندہ کی خوب نہیں ہوئی حسب تحقیق اپنی کے سب نے فرمایا ہے اور اصل مسئلہ میں کسی کو خلاف نہیں اور بندہ کو خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔"[3]

---

[1] مہاجر دیوبند ج ۲ نمبر ا ص ؛ [2] مہاجر ج ۲ نمبر ا

[3] فتاویٰ رشیدیہ مطبوعہ قرآن محل کراچی۔ باب الربوا ص ۴۳۰۔

رشید احمد عفی عنہ گنگوہی۔ غور کیجئے کہاں وہ جزم و یقین اور کہاں یہ تردد و تذبذب۔ اس موخر الذکر فتوی پر جو تاریخ کندہ ہے وہ ۱۳۰۱ ہجری ہے۔ پہلے فتوی پر نہ دستخط ہیں اور نہ تاریخ۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ اگر واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے بھی تو فتوی ثانی پر یقیناً برسوں مقدم ہوگی۔ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ۱۳۰۱ ہجری سے برسوں پہلے تو حضرت کو ہند کی کیفیت کا بخوبی اور واضح طور پر علم تھا اور اس بنا پر آپ نے ملک کو دار الحرب قرار دے دیا۔ لیکن اس واقعہ کے برسوں بعد آپ کو ہند کی کیفیت کی خوب تحقیق نہیں رہی اور اس لیے اب ہند کو نہ دار الاسلام فرماتے ہیں؟ اور نہ دار الحرب۔ کیا کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس ترتیب کو باور کر سکتا ہے!!

<u>ایک تضاد</u> اس کے علاوہ ایک اور اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ مفتی محمد شفیع صاحب کے شائع کردہ رسالے کے خاتمہ پر مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے حواشی کے علاوہ ایک عبارت بھی لکھی ہے جس میں وہ حضرت گنگوہی کے حوالہ سے ہندوستان کو دار الامان کہتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"یہاں یہ بات ظاہر کر دینا بہت ضروری ہے کہ آج کل ہندوستان باستثنار اسلامی ریاستوں کے اگرچہ حضرت مجیب (مولانا گنگوہی) اور حضرت شاہ عبدالعزیز اور بعض دیگر اکابر کی تصریح کے مطابق دار الحرب ہے۔ مگر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دار الامان ہے۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے مسلمانوں کو ہجرت ضروری نہیں ہے۔ کاتب الحروف کے استفسار پر حضرت گنگوہی نے ایسا ہی مشافہۃً فرمایا تھا جو بندہ کو خوب اچھی طرح سے یاد ہے[1]"

ان تینوں تحریروں کو سامنے رکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مولانا گنگوہی نے ہندوستان کی نسبت فرمایا۔

(الف) ہند دار الحرب ہے۔

(ب) ہند کے متعلق بندہ کو خوب تحقیق نہیں۔

---

[1] رسالہ مذکورہ ص ۱۶

(ج) ہند دارالامان ہے۔

اب کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

تاریخی پس منظر | حقیقت یہ ہے کہ آپ اس معمہ کو اس وقت تک حل کر ہی نہیں سکتے جب تک ان آرا اور افکار و خیالات کو گزشتہ دو ڈھائی سو برس کی تاریخ کے پس منظر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت پر زوال طاری ہوا تو کسی منزل پر پہونچ کر رکا نہیں، بلکہ روز بروز حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانے میں ہی جو عالمگیر کی وفات سے پانچ برس یعنی ۱۷۰۲ء میں پیدا ہوئے تھے پوری سوسائٹی "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" کا مصداق بن گئی تھی۔ چنانچہ شاہی خاندان، اعیان و امرار، علمار، صوفیا، تجار، عوام اور خواص غرضکہ کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس کا ماتم شاہ صاحب نے تفہیمات میں خصوصاً اور دوسری کتابوں میں عموماً بڑے درد و کرب کے ساتھ نہ کیا ہو، اخلاقی زندگی کے حد درجہ فاسد ہونے کے ساتھ بد امنی اور شورشِ عام کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کی نہ جان محفوظ تھی اور نہ مال، ان کی عبادت گاہیں اور عورتوں کی عصمت و ناموس تک خطرہ میں تھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں۔

دہلی والوں کے لیے زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ بہت سے مسلمان تھے جو خودکشی کے ذریعہ ان مصائب و آلام ناگفتنی سے رستگاری کی سوچنے لگے تھے۔[1]

اس وقت خوف و ہراس اور دہشت و سراسیمگی کا کیا عالم تھا! اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ کے اس شعر سے ہوگا!

کانّ نجوماً اومضت فی الغیاھب عیون الافاعی اورؤس العقارب

ترجمہ:- جو تارے تاریکیوں میں چمکتے ہیں وہ بھی ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا وہ سانپوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے ڈنک۔

ہندوستان جو فقہار کی اصطلاح کے مطابق چھ سو برس سے دارالاسلام بنا چلا آرہا تھا۔ ان حالات نے شاہ صاحب جیسے مفکر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اب بھی دارالاسلام ہے یا

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۴۳۱

نہیں؟ اگرچہ ہماری نظر سے کہیں نہیں گذرا کہ شاہ صاحب نے ملک کو دارالحرب کہا ہو لیکن وہ ملک کا جو نقشہ کھینچتے اور اس کے جو حالات بیان کرتے ہیں وہ ہرگز کسی دارالاسلام کے نہیں ہو سکتے اور اس بنا پر یہ بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ ان کے نیم شعوری ذہن میں ہندوستان کی نسبت دارالحرب میں منتقل ہو جانے کا تصور موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے نہایت اثر انگیز اور پُرجوش خطوط کے ذریعہ نجیب الدولہ اور نظام الملک کو فوجی طاقت کے ذریعہ اصلاحِ حال کی دعوت دی اور آخر کار جب اس سے کام نہیں چلا تو احمد شاہ ابدالی کو ایک نہایت مفصل خط لکھا جس میں ملک کی سیاسی حالت کو واضح طور پر بیان کرنے کے بعد مکتوب الیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کو مرہٹہ راج گردی سے نجات دے[1]۔

ابدالی طوفان برق وباد کی طرح آیا مگر!

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا　　سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں!

میدانِ پانی پت میں اس نے مرہٹوں کو شکستِ فاش دی اور جو کچھ ہاتھ لگا اسے لے لوا کر واپس چلا گیا۔ اس زبردست بھونچال سے عبرت پذیر ہو کر سنبھلنے کے بجائے مریضِ سلطنت کا حال اور ابتر ہو گیا مرہٹوں کا اب وہ زور تو رہا ہی نہیں تھا اس بنا پر نتیجہ یہ ہوا کہ ایک غیر ملکی اور اجنبی طاقت انگریزوں کی ابھرنی شروع ہوئی یہ نہایت منظم، ترقی یافتہ اور حوصلہ مند طاقت تھی، اس نے جنوب اور مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے پورے ملک میں اس درجہ اثر و نفوذ قائم قائم کرلیا کہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہو گئیں اور اکبر و جہانگیر کے تخت و تاج کا وارث شاہ عالم انگریزوں کا وظیفہ خوار قیدی بن کر رہ گیا۔

شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ یہ بالکل ایک نئی صورتِ حال تھی جو اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آئی تھی اس بنا پر شاہ عبدالعزیز (از ۱۱۵۹ھ - تا ۱۲۳۹ھ) جو ایک جماعت کے ساتھ اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی فکری امانت کے حامل اور ترجمان تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں ہندستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ چنانچہ بعض کتبِ فقہ سے کچھ عبارتیں نقل کرنے کے

---

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص از ۵۰ تا ۵۳

بعد فرماتے ہیں:۔

"اس شہر (دہلی) میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں ہے، بلکہ نصاری کے سرداروں اور افسروں کا حکم بے دغدغہ جاری ہے .... ہاں اگر بعض اسلامی احکام مثلاً جمعہ اور عیدین اور اذان اور گاؤ کشی وغیرہ سے یہ لوگ تعرض نہیں کرتے ہیں تو پڑے نہ کریں مگر ان احکام کی اصل الاصول ان کے نزدیک بالکل ہیچ اور ضائع ہیں۔ کیوں کہ مسجدوں کو جو خانۂ خدا ہیں بے تکلف مسمار اور خراب کرا دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلم یا ذمی (غیر مسلم) انگریزوں سے پناہ لیے بغیر دلی یا اس کے گرد و نواح میں داخل ہونا چاہے تو ممکن نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شجاع الملک اور ولایتی بیگم بھی ان لوگوں کی اجازت کے بغیر اس شہر میں نہیں آسکتے ...... غرضکہ جب حدیثوں اور صحابۂ کرام اور خلفائے عظام کی سیرت پر متجسس نگاہیں ڈالی جاتی ہیں تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ شہر دار الحرب کا حکم رکھتا ہے[1]"

علاوہ ازیں ایک شخص نے دار الحرب میں سود لینے کے بارہ میں سوال کیا ہے تو حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں بھی دار الحرب اور دار الاسلام کی بحث چھیڑ دی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف اقوال و آرا نقل کرنے اور اپنی رائے بیان کرنے بعد لکھتے ہیں۔

"اور جب یہ ہے تو انگریزوں اور ان جیسے کافروں کے مقبوضات بلاشبہ دار الحرب ہیں۔"

<u>دیگر علما کے فتاوی</u> شاہ عبد العزیز صاحب اس فتوے میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ دوسرے علما کا فتویٰ بھی یہی تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے۔

---

[1] فتاوی عزیزیہ ص ۱۶ و ۱۷

" جون جون ہماری (انگریزوں کی) طاقت مضبوط ہوتی گئی علما کے فتووں میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبدالحی صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز کے بعد ہوئے صاف طور پر حکم لگاتے ہیں کہ " عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستان خاص سے ملحقہ ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے تک) سب کی سب دارالحرب ہے کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پاچکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہوجائیں وہ دارالحرب ہے[1]"

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک

ہندوستان کے انگریزی مقبوضات جن میں دلی بھی شامل تھی، ان کے متعلق علمائے اعلام کی طرف سے دارالحرب ہونے کا اعلان ہوجانے کے بعد اب مسلمانوں کے لیے صرف دو راہیں ہی ہوسکتی تھیں، ایک یہ کہ اگر ان میں ہمت ہے تو جہاد کریں اور دوسرے یہ کہ اگر جہاد نہیں کرسکتے تو ہجرت کرجائیں۔ دوسری شکل اختیار کرنا صد درجہ کی بزدلی اور نامردی کی بات ہوتی اس لیے پہلی صورت اختیار کی گئی۔ چنانچہ مدرسہ شاہ ولی اللہ کے تربیت یافتہ خصوصی سید احمد شہید بریلوی ۱۶ اری ۱۸۲۶ء کو اپنے پانسو چھ سو معتقدین و مریدین کے ساتھ وطنِ مالوف سے روانہ ہوئے مہینوں کے سخت دشوار اور کٹھن سفر کے بعد ایک جمعیت کثیر مہیا کی اور سرحد پہونچ کر، ۱۸۲۷ء کے ابتدا ہی میں جہاد کا اعلان کردیا۔ یہ اعلان اگر پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا جہاں اسلامی شعائر کے علانیہ اظہار و بجا آوری تک پر پابندیاں تھیں لیکن سید صاحب نے کل ہند پیمانہ پر جو تیاریاں کی تھیں وہ صاف طور پر اس بات کی علامت ہیں کہ آپ کا اصل مقصد ہندوستان سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنا اور اسے صحیح معنی میں دارالاسلام بنانا تھا۔ چنانچہ آپ نے سرحد سے ریاست گوالیار کے مدارالمہام راجہ ہندو راؤ کو جو مکتوبِ گرامی لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں:۔

" جناب پر یہ بات روشن اور ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ سمندر پار سے یہاں آکر بادشاہِ زمین و زماں ہوگئے ہیں اور جو سوداگر تھے وہ سلطنت کے مرتبہ کو پہونچ

---

[1] بحوالہ نقش حیات از مولانا سید حسین احمد مدنی رح جلد ۲ حاشیہ ص ۲

گئے ہیں، ان لوگوں نے بڑی بڑی امارتیں اور ریاستیں برباد کردی ہیں اور ان کی عزت وآبرو کو خاک میں ملا دیا ہے (ان حالات کے باوجود) چونکہ اربابِ ریاست وسیاست گوشۂ گمنامی و بے عملی میں پڑے ہوئے ہیں اس لئے ہم چند فقیر و اہلِ مسکنت محض دین رب العلمین کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔"

علاوہ ازیں مذکورۂ بالا ریاست کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خاں کو جو خط لکھا ہے اس میں بھی اسی مضمون کا اعادہ کیا ہے فرماتے ہیں:۔

"آپ سردار والا مراتب راجہ ہندو رائے کو یہ امر ذہن نشین کرادیں کہ ہندوستان کے اکثر شہر غیر ملکی لوگوں (انگریزوں) کے قبضہ میں جا چکے ہیں اور یہ ہر جگہ ظلم و زیادتی کر رہے ہیں ہندوستانی ریاستوں کو انھوں نے برباد کردیا ہے اور کوئی شخص ان کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا۔ بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ ان حالات میں چونکہ بڑے بڑے اربابِ ریاست ان کے ساتھ نبرد آزمائی سے عاجز ہیں اس لیے ہم چند ضعیف و کمزور انسان کمرِ ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔"[1]

قدرت اپنی حکمتیں خود ہی جانتی ہے۔ یہ جہاد ناکام رہا اور سید صاحب گھر سے ایسے رخصت ہوئے تھے کہ پھر واپس نہ آئے۔ ایک رہروِ راہِ طلب وجستجو کی غیرت وخودداری کی انتہا ہے!

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے (غالب)

سید صاحب اپنے ہزاروں فداکاروں کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرکے واصل بحق ہوگئے لیکن جو آگ ہزاروں دلوں میں روشن کرچکے تھے وہ دشمن کے آبِ شمشیر سے کہاں بجھ سکتی تھی ان کے بعد تحریکِ مجاہدین کا ایک مکمل اور مربوط سلسلہ صادق پور سے درۂ خیبر تک قائم ہوگیا۔ اور اب ان کا براہ راست مقصد انگریزوں کو ملک باہر کرکے اس کی قدیم حیثیت کو بحال کرنا تھا، ادھر یہ مجاہدین

---

[1] مجموعۂ خطوط قلمی بحوالہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا" از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۲۷۵-۲۷۶

اپنی جدوجہد میں مصروف تھے اور ادھر دلی اور لکھنؤ میں تیزی سے وہ حالات پیدا ہو رہے تھے جن کے بطن سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ظہور ہوا۔

جہاد کا براہِ راست فتویٰ — آخر انگریزوں کی روز افزوں زیادتیوں اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی بیچارگی و بے بسی کے باعث جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو دلی کے اخبار "الظفر" میں کھلم کھلا یہ استفتا چھپا:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہلِ اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرضِ عین ہے یا نہیں؟ ......

اس استفتا کا جواب مرتب کرنے کے لیے جامع مسجد دلی میں علمائے کرام کا ایک اہم اجتماع ہوا اور فتویٰ ذیل مرتب کر کے شائع کیا گیا:

الجواب: درصورتِ مرقومہ فرضِ عین ہے اور پر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرتِ اجتماع افواج کے اور موجود ہونے آلاتِ حرب کے تو فرضِ عین ہونے میں کیا شک رہا الخ[۱]"

مولانا فضل حق کا فتویٰ — اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل موجود ہے اس پر ۳۸ دلی کے علما و مشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے اس پر دستخط نہیں ہیں لیکن ان کا ایک الگ مستقل فتوائے جہاد تھا جس کا ذکر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مولانا بلند پایہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت و جسارت اور دینی حمیت و غیرت کا

۱۔ مجموعہ خطوط قلمی بحوالہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا" از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۲۷۴-۲۷۶

۲۔ جنگ آزادی از خورشید مصطفیٰ صاحب رضوی ص ۵۶۸۔

یہ عالم تھا کہ انھوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے بعد جہاد کے ایک اور فتوی کا اعلان ہوا جس پر صدر الصدور مفتی صدر الدین خان آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خان اکبرآبادی اور دوسرے علما کے دستخط تھے، اس فتوی کے شائع ہوتے ہی ملک میں آگ لگ گئی اور خاص دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔[1] ادھر یہ ہوا اور دوسری طرف اکابر دیوبند جو سلسلۂ ولی اللہی کے بقیۃ السلف تھے یعنی حضرت حاجی امداد اللہ، مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی وغیرہم انھوں نے باقاعدہ جہاد کا فتوی دیا اور جب جنگ چھڑی تو اس میں عملاً حصہ لے کر دادِ شجاعت دی۔

مسلمانوں کے لیے یہ جہاد تھا۔ لیکن استخلاص وطن کی غرض سے غیر مسلم بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ اور اس بنا پر اس کا اہتمام و انتظام بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ لیکن باایں ہمہ یہ کوشش بھی ناکام رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے باضابطہ طور پر تاج برطانیہ کے مقبوضات و مستعمرات میں شامل ہوگیا۔ اس جنگ میں ناکامی کے باوجود مجاہدین نے ہار نہیں مانی اور ان کی سرگرمیاں ایک خاص دائرۂ عمل میں برابر جاری رہیں اور ۱۸۶۲ء و ۱۸۶۸ء میں انگریزوں اور مجاہدین میں سخت معرکہ ہوا۔

اگرچہ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا کہ اب کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا، ہر شخص کو مذہبی آزادی ہوگی اور حصولِ معاش کے دروازے کسی پر بند نہیں ہوں گے لیکن شروع شروع میں اس اعلان پر خاطر خواہ عمل نہیں ہوا اور مجاہدین کی سرگرمیاں بھی برابر جاری رہیں۔ لیکن انگریزوں کی حکومت میں جتنا استحکام پیدا ہوتا رہا۔ ملک میں امن و امان اور انفرادی و جماعتی آزادی کی فضا پیدا ہوتی رہی۔ اب مذہب آزاد تھا۔ دینی تعلیم و تبلیغ پر کوئی پابندی نہیں تھی، قانون مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت کرتا تھا اور اس پر عمل بھی ہو رہا تھا۔ حصولِ معاش کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو سرکاری

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۵۶۔

دفتروں اور محکموں میں جگہیں مل رہی تھیں۔ غرضکہ اب انگریز کے ساتھ جنگ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ملک میں ایک آئینی حکومت قائم تھی۔ اگرچہ بدیشی تھی اور یہ صورت پہلی صورت حال سے بالکل مختلف تھی۔ پہلے جنگ تھی۔ اب صلح تھی۔ پہلے حرب وضرب کا دور تھا اب امن وامان کا عہد تھا اور اب مسلمانوں کے لیے موقع تھا کہ وہ تعلیمی اقتصادی اور مذہبی بنیادوں پر تنظیم کر کے اپنے لیے نشاۃ ثانیہ کا سروسامان کریں۔

مولانا گنگوہی کے مختلف اقوال کی وجوہ سطور بالا میں ہم نے حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے لے کر انیسویں صدی کے ربع آخر تک کے حالات کا جو نہایت ہی مختصر اور سرسری جائزہ؟ لیا ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس پوری مدت میں ملک کے حالات یکساں نہیں رہے بلکہ ادلتے بدلتے رہے ہیں اور جو تغیر ہوتا رہا ہے بحیثیت مجموعی علما کا اس ملک کے متعلق شرعی نقطۂ نظر بھی بدلتا رہا ہے۔ اس بنا پر مولانا گنگوہی سے اگر اس سلسلہ میں تین قول ثابت ہیں تو یہ حیرت کی بات نہیں بلکہ یہ حالات کے تغیر کا اثر ہے۔ چنانچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا کا پہلا فتویٰ بزبان فارسی وشائع کردہ مفتی محمد شفیع صاحب یا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے کا ہے یا اس کے فوراً بعد کا جبکہ پکڑ دھکڑ بڑے پیمانہ پر جاری تھی اور ادھر مجاہدین بھی سرگرم عمل تھے۔ اس کے بعد جب حالات ذرا بہتر ہوئے۔ مگر مطلع بالکل صاف نہیں ہوا تھا تو مولانا کو اب پہلی رائے پر اصرار تو نہیں رہا۔ لیکن ساتھ ہی کھلی کر دار الحرب ہونے کی نفی بھی نہیں کر سکے۔ اور جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کسی قطعی بات کے کہنے سے معذرت فرمادی۔ پھر جب حالات اور زیادہ بہتر ہوئے امن وامان مکمل طور پر بحال ہو گیا اور مذہبی فرائض ومعمولات بلاخوف وخطر ادا ہونے لگے تو اب حضرت گنگوہی نے اس کو دار الامان ہی قرار دیا۔

حضرت نانوتوی کا ارشاد مولانا گنگوہی نے تو ترقی کر کے ہندوستان کو دار الامان ہی کہا ہے لیکن مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے "ہندوستان میں سود کی لین دین" پر بصورت مکتوب جو ایک نہایت مختصر اور مبسوط رسالہ لکھا ہے اس میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

باعتبار روایات منقولہ ہندستان دار الاسلام ہے … ان روایات کے پیش نظر ہندستان دار الاسلام ہے

اگرچہ اس معاملہ میں مولانا کو پورا اطمینان نہیں ہے۔ چنانچہ آخر رسالہ میں فرماتے ہیں:

"دار الحرب بودن ہندوستان کلام چنانچہ
از مطالعۂ روایاتِ منقولہ دریافتہ باشی
اگرچہ راجح نزد ہیچدان ہمین باشد کہ
ہندوستان دار الحرب است[1]

ہندوستان کے دار الحرب ہونے میں کلام ہے،
جیسا کہ گذشتہ روایاتِ منقولہ سے تم کو معلوم ہوا ہوگا
اگرچہ اس ہیچدان کے نزدیک راجح یہی ہے
کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔

لیکن چونکہ رسالہ کا اصل موضوعِ بحث دار الحرب میں "سودی لین دین" ہے اس بنا پر مولانا نے اس پر بڑی سیر حاصل بحث کے ضمن میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ "اوّل تو ہندوستان دار الحرب نہیں دار الاسلام ہے۔ لیکن اگر دار الحرب ہے بھی تو مسلمان کے لیے حسب روایاتِ فقہیہ یہ کہاں جائز ہے کہ وہ دار الحرب میں قیام کر کے سود کھاتا رہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ سود دار الحرب میں لے اور اسے برتے دار الاسلام میں جو لوگ ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر اس میں سودی لین دین کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مولانا نانوتوی ان پر ایک نہایت لطیف قسم کا طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ بڑے عجیب و غریب قسم کے لوگ ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ اچھا! اگر ہندوستان دار الحرب ہے تو تمہیں ہجرت کرنی چاہیے۔ اس پر وہ کہتے ہیں کہ یہ دار الاسلام ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں کہ یہاں سودی کاروبار جائز نہیں تو جھٹ بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو دار الحرب ہے، گویا چت بھی ان کی اور پٹ بھی ان کی، ہجرت سے بچنے کے لیے اس ملک کو دار الاسلام کہہ دیا اور سود کھانے کے لیے اسے دار الحرب قرار دے دیا۔ سبحان اللہ![2]

مولانا عبد الحی لکھنوی کا فتویٰ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی اُن علما میں سے تھے جنھوں نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ میدان جنگ میں اس سے مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران میں اور اس کے بعد مسلمانوں کی خصوصاً اور عام اہلِ ملک کی عموماً عظیم تباہی

---

[1] قاسم العلوم جلد اوّل مشتمل بر مکتوب ہفتم و ہشتم۔ مطبع مجتبائی دہلی ص ۲۸ و ۳۵۔
[2] قاسم العلوم جلد اوّل مشتمل بر مکتوب ہفتم و ہشتم۔ مطبع مجتبائی دہلی ص ۲۹۔

وبربادی خستہ حالی وپامالی بچشم خود دیکھی تھی۔ اس بنا پر حالات خواہ کیسے ہی پُر امن ہوں بہرحال انگریز کے خلاف دلوں میں جو کدورت اور عہدِ گذشتہ کی جو تلخ یاد تھی اس کی وجہ سے یہ حضرات ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق کوئی بات کہتے بھی ہیں تو رک رک کر اور کسی درجہ میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ لیکن مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی جن کی پیدائش ہی ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے اُن کے لیے اس قسم کا کوئی حجاب ذہنی نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے بالکل صاف وصریح لفظوں میں ہندوستان سے دارالحرب ہونے کی نفی کی اور اس کے دارالاسلام ہونے کا اثبات کیا ہے۔

سوال یہ تھا کہ "جہاں تک عملداری انگریزوں کی ہے۔ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو صرف صاحبین کے مذہب کے مطابق یا ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق بھی" مولانا جواب میں فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے۔" اس کے بعد مولانا نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کتبِ فقہیہ سے طویل عبارتیں نقل کیں اور ان کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:۔

"ان عبارات سے اور ان کے امثال سے واضح ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہونے میں یہ شرط ہے کہ احکامِ کفر علانیہ جاری ہوں اور احکامِ اسلام بالکلیہ موقوف کردئے جائیں اور شعائرِ اسلام اور ضروریاتِ دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں اور یہ شرط اتفاقی (متفق علیہ) ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں زائد کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس بلدہ میں اور دارالحرب میں کوئی بلدہ مملکت اہلِ اسلام کا باقی نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ امان اوّل اٹھ جائے اور باامانِ کفار امنیت کی نوبت آئی ہو اور ظاہر ہے کہ بلادِ ہندوستان میں یہ مفقود ہے۔ اس لیے کہ شعائرِ اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت اور ممانعت نہیں ہے۔ اگرچہ اکثر قضاۃ کفار ہیں اور خلافِ اسلام احکام جاری کرتے ہیں مگر بہت سے امور میں مذہبِ اسلام اور شرع کے موافق بھی فیصلہ کرتے ہیں پس ہندوستان امام ابوحنیفہ

اور صاحبین رحمہم اللہ کسی کے نزدیک دار الحرب نہیں ہے[1]۔

ایک اور فتویٰ | اسی نوع کا ایک اور فتویٰ کلکتہ میں نواب عبد اللطیف صاحب نے جب انھوں نے بنگال میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک شروع کی تھی۔ بعض علماء سے حاصل کرکے شایع کیا تھا ان علماء میں تحریک مجاہدین کے ممتاز عالم مولانا کرامت علی صاحب بھی شامل تھے اور فتویٰ میں کہا گیا تھا کہ "انگریزوں کے ماتحت ہندوستان دار الحرب نہیں ہے[2]۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمان لذت کشی دردتہ جام کی زندگی بسر کر رہے تھے اس وقت مسلمانوں میں کوئی سیاسی تحریک نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو خفیہ یعنی انڈر گراونڈ اور ان کی تمام تر توجہات دیوبند اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر جیب و دامانِ تار تار پر بخیہ گری کے لیے وقف تھیں۔ کانگریس اور لیگ دونوں اگرچہ وجود میں آ چکی تھیں لیکن اوّل الذکر کا مقصد انگریزوں کے ماتحت چند داخلی اور انتظامی اصلاحات اور موخر الذکر کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا اس بنا پر ہندوستان پر جب دار الحرب کی تعریف صادق نہیں آتی تھی تو مولانا عبد الحی کو لامحالہ اسے دار الاسلام ہی کہنا تھا[3]۔

تحریک ہجرت | لیکن جن علماء کے سینوں میں سید احمد شہید کی لگائی ہوئی آگ کے شعلے ابھی تک خاکستر نہیں ہوئے تھے وہ کب نچلے بیٹھنے والے تھے انھوں نے ایک فتویٰ کے ذریعہ ترکِ وطن کی تحریک شروع کردی مولانا غلام رسول مہر جو ہند و پاک کی جدید اسلامی تاریخ کے مبصر عالم ہیں بیان کرتے ہیں:-

"تحریکِ خلافت کی تنظیم سے پیشتر علماء کے فتویٰ سے یہاں ہجرت کی تحریک

---

[1] ترجمۂ اردو مجموعۃ الفتاویٰ مولانا محمد عبد الحیؒ مطبوعہ قیوم پریس کانپور جلد اوّل ص از ۱۲۳ تا ۱۲۶۔

[2] ہندوستانی مسلمان (انگریزی) رام گوپال صاحب ص ۶۹۵

[3] ہمیں ان حضرات اور مشائخ کا بھی علم ہے جنھوں نے سفید فام فرمانروایانِ ہند کو ناصر الملۃ والدین اور حامی شریعت مصطفوی کہا ہے اور ترکوں کے مقابلہ میں بھیجے ہوئے ہندوستانی مسلمان فوجیوں کے بازوؤں پر تعویذ باندھے ہیں لیکن ان حضرات کو عوام میں کوئی سند اعتماد و اعتبار حاصل نہیں ہے اس لیے ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔

جاری ہوئی۔ میرے نزدیک اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے اور دنیا بھر میں اسے بدنام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسرے ملکوں میں یہ اطلاع پہونچتی کہ لاکھوں مسلمان ترکِ وطن پر مجبور ہوئے ہیں تو انگریزوں کے لیے نیک نامی کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔ یہ وقتی تحریک تھی۔[1]

دوسری تحریکیں | انھیں دنوں میں یعنی انیسویں صدی کے اواخر میں کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت وشمولیت کا مسئلہ اٹھا اور مولانا گنگوہی، مولانا محمود حسن اور لدھیانہ و دیوبند کے بہت سے علماء نے کانگریس میں شرکت کے جواز اور سر سید کی قائم کی ہوئی جماعت "جماعت محبانِ وطن" میں شرکت کی ممانعت کا فتویٰ شایع کیا۔[2] پھر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قیادت میں تحریک انقلاب یا بالفاظِ دگر ریشمی خطوط کی تحریک شروع ہوئی اس کے بعد خلافت اور پھر ترکِ موالات کی تحریکوں کا دور آیا۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس پورے دور میں جبکہ انگریزوں کے خلاف یہ تحریکیں چل رہی تھیں، ہندوستان کی نسبت ان علماء کا جو تحریکوں سے وابستہ تھے شرعی طور پر کیا نقطۂ نظر رہا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ان تمام تحریکوں کا مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج اور ملک کی آزادی تھا۔ لیکن اگر یہ تمام کوششیں آئین اور قانون کے اندر رہ کر کی گئی ہیں تو ظاہر ہے اس صورت میں ملک کی شرعی حیثیت کچھ اور ہوتی ہے اور اگر ان تحریکوں میں حرب و ضرب تشدد، اور قانون شکنی وغیرہ ان سب چیزوں کو تحریکوں کے بانی اور ہمدرد علما کی تائید و رضا مندی کی سند حاصل تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی نظر میں ہندوستان کی حیثیت پہلی حیثیت سے مختلف تھی۔

دارالعہد | اس سلسلہ میں ہم صرف دو تحریریں پیش کر سکتے ہیں۔ ایک مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کی اور دوسری مولانا سید حسین احمد مدنی کی! حضرت شاہ صاحب کے متعلق اجمالاً گزر چکا ہے

---

[1] ملاقاتیں: مرتبۂ الطاف حسن صاحب قریشی ص ۱۸۷

[2] نقشِ حیات: از مولانا حسین احمد صاحب مدنی جلد دوم ص ۱۷

کہ آپ نے پشاور کے خطبۂ صدارت میں ہندوستان کو دارالامان کہا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اسی موقع پر اشارہ کیا تھا۔ درحقیقت شاہ صاحب کی مراد دارالامان سے دارالعہد ہے۔ چنانچہ خطبۂ متعلقہ میں آپ نے حکومت اور مسلمانوں کے تعلقات کی شرعی نوعیت کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا بدرِ عالم مرحوم حضرت شاہ صاحب سے نقل کرتے ہیں:-

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی ہندوستانیوں کو انگریز کے ہاتھوں میں قیدی سمجھتے تھے اور کسی معاہدہ کے قائل نہیں تھے لیکن میرے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ اگرچہ حکومت اور اہلِ ہند کے درمیان باقاعدہ کوئی معاہدہ نہیں ہے لیکن عملاً معاہدہ ہے۔ چنانچہ ہم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔ اور جانی و مالی امور میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور ان تمام معاملات میں ہم ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقین معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کو کسی فقیہ نے نہیں لکھا ہے۔ مگر میرے نزدیک حکم یہی ہے اور اس پر ہی تمام تفریعات ہوں گی۔"[1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب معاہدہ ہے تو پھر قومی تحریکوں میں توڑ پھوڑ مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی جو چیزیں ہوتی ہیں ان کے جواز کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ یہ سب نقضِ عہد میں داخل ہیں اور اسلام میں نقضِ عہد سخت گناہ ہے، غالباً یہی سوال حضرت شاہ صاحب کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ عبارت مذکورۂ بالا کے فوراً بعد جواباً فرماتے ہیں:-

"یہ معاہدہ پہلے جان اور مال دونوں کے متعلق تھا۔ لیکن اب جان سے متعلق معاہدہ کو ہم نے ان کے منہ پر دے مارا ہے (یعنی وہ ہماری جان کے ذمہ دار نہیں اور ہم ان کی جان کے نہیں) البتہ اموال کے بارہ میں معاہدہ اب تک باقی ہے۔ چنانچہ انگریزوں کا مال چرانا جائز نہیں ہے۔

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری جلد ۳ ص ۴۴۹۔

اور وہ بھی امن وامان کے ساتھ! مسلمانوں نے خود اپنے عہد حکومت کے گزشتہ دو سو برس میں نہیں کی تھی۔ چنانچہ راج گوپال آچاریہ کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے ایک ظالم کی گولی کا نشانہ بننے سے دو برس پہلے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے راج میں ننانوے فی صدی آزادی رکھتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے[۱]

بہر حال مولانا محمد انور شاہ اور مولانا حسین احمد دونوں ایک ہی مکتبۂ فکر کے بزرگ اور ایک ہی استاد کے نامور شاگرد تھے لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق دونوں میں جو اس قدر شدید اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ مولانا مدنی پر سیاسی انقلاب پسندی اور انگریز دشمنی کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ اس معاملہ میں فقیہانہ سنجیدگی اور متانت اور تاریخ کا واقعاتی شعور مغلوب ہو جاتے تھے۔

اس کے برخلاف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جو باعتبار تفقہ اپنے تمام معاصرین میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔ ان کو دیکھیے۔ آپ نے امداد الفتاوی میں متعدد مقامات پر ہندوستان میں سود لینے کے مسئلہ پر گفتگو کی لیکن ہندوستان کو کہیں دار الحرب نہیں لکھا۔ بلکہ آپ کا یہ ارشاد عام طور پر مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے ریل کا ٹکٹ نہیں خرید سکا اور اسی حالت میں اس نے سفر بخیر وخوبی طے کر لیا تو اب اسے چاہیے کہ اتنی ہی مسافت اور اسی درجہ کا ایک ٹکٹ خرید کر چاک کر دے تاکہ گورنمنٹ کا نقصان نہ ہو۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

ہم نے یہاں تک صرف اکابر علمائے احناف کے ارشادات وبیانات پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کے علما بھی بڑی اہمیت کے مالک رہے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارے میں ان علمائے اعلام کی آرا اس لیے اور بھی لائق توجہ ہیں کہ اس جماعت نے ہی سب سے زیادہ سرگرمی اور جوش کے ساتھ حضرت احمد شہید کے زیر قیادت انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے میں حصہ لیا تھا اور اسی

---

[۱] انگریزی روزنامہ اسٹیٹمین مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۶۶ء ص ۸ کالم ۳

بنا بریں انگریز انھیں بدنام کرنے کی غرض سے وہابی کہتے تھے۔ بہرحال اس جماعت کے علماء میں مولانا ابوسعید محمد حسین لاہوری (جو عام طور پر بٹالوی بھی مشہور ہیں) بلند پایہ عالم اور صاحب تصنیف وقلم بزرگ تھے۔ لاہور سے **اشاعۃ السنۃ** نامی ایک دینی پرچہ شائع ہوتا تھا۔ مولانا اس کے اڈیٹر اور زمانہ کے اعتبار سے سرسید احمد خاں۔ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے ہمعصر تھے۔ موصوف نے ۱۸۷۶ء میں ایک رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے نام سے لکھا تھا جو انھیں دنوں میں وکٹوریہ پریس میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں مولانا نے بڑی قوت اور زور سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان ہرگز دارالحرب نہیں ہے اور اسی بنا پر انگریزوں کے خلاف جہاد جائز نہیں، چنانچہ لکھتے ہیں :-

"جو مخالفین اسلام کسی کے مذہب سے تعرض کرنا جائز نہ سمجھیں اور اس امر کو خواہ بمقتضائے مداہنت خواہ بہ ہدایت مذہب خواہ بحکم عقل واصولِ سلطنت بہت بُرا سمجھیں۔ جیسا کہ برٹش گورنمنٹ کا حال وچال ہے۔ ان سے مذہبی جہاد کرنا ہرگز جائز نہیں"[1]

یہ تو ہوئی جہاد کی بات! اب ملک کی شرعی حیثیت کے بارے میں سُنیے۔ فرماتے ہیں :-

"جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی حاصل ہو وہ شہر یا ملک دارالحرب نہیں کہلاتا۔ پھر اگر وہ در اصل مسلمانوں کا ملک یا شہر ہو۔ اقوام غیر نے اس پر تغلب سے تصرف پالیا ہو (جیسا کہ ملک ہندوستان ہے) تو جب تک اس میں ادائے شعائر اسلام کی آزادی رہے وہ بحکم حالتِ قدیم دارالاسلام کہلاتا ہے کہلاتا ہے۔ اور اگر وہ قدیم سے اقوام غیر کے قبضہ وتسلط میں ہو مسلمانوں کو انہی لوگوں کی طرف سے ادائے شعائر مذہبی کی آزادی ملی ہو تو وہ بھی دارالاسلام اور کم سے کم دارالسلم والامان کے نام سے موسوم ہونے کا مستحق ہے"[2]

---

[1] الاقتصاد فی مسائل الاجتہاد صفحہ ۱ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۹

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مولانا محمد حسین صاحب نے جو کچھ اس رسالہ میں لکھا ہے وہ اس میں منفرد نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ رسالہ کے شروع میں (صفحہ ۳ و ۴) خود انھوں نے لکھا ہے یہ رسالہ انھوں نے ۱۸۷۰ء میں لکھ لیا تھا لیکن اس کو شائع کرنے سے قبل انھوں نے علمائے اسلام کی رائے لینے کی غرض سے لاہور سے عظیم آباد پٹنہ تک کا سفر کیا اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"اور اکابر علمائے مختلف فرقہائے اسلام کو یہ رسالہ حرف بہ حرف سنا کر ان کا توافقِ رائے حاصل کیا اور بعض بلاد ہندوستان (پنجاب میں) جہاں راقم خود نہیں جا سکا۔ اس رسالہ کی متعدد کاپیاں بھجوا کر ان بلاد کے اکابر علما کا اتفاق رائے حاصل کیا۔"

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کس پایہ کے عالم تھے؟ ان کی تصنیفات اور ترجمۂ قرآن سے ظاہر ہے۔ ان کے نزدیک بھی ہندوستان دارالحرب نہیں تھا بلکہ اگر کسی وقت انگریزوں نے مسلمانوں کے سفر حج پر کوئی پابندی مذہبی تعصب کے بغیر کسی عام مصلحت سے لگائی تھی تو وہ ہرگز مداخلت فی الدین تھی چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"دارالحرب سے مراد وہ ملک ہے جس میں کافروں کی عملداری ہو اور وہاں کا حاکم مذہبی ضد سے مسلمانوں کو فرائض اسلامی نماز روزہ حج زکوٰۃ کے بجا لانے سے روکے اور منع کرے۔ ایسے ملک میں مسلمانوں کو رہنا درست نہیں ... خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ہندوستان باوجودیکہ نصاریٰ کی عملداری ہے دارالحرب نہیں ہے اس لیے کہ یہاں بجا آوریِ فرائض میں کسی طرح کی روک ٹوک نہیں۔ اور جو طاعون کی وجہ سے حاجیوں کو سفر حجاز سے روکا جاتا ہے تو یہ روکنا حکماً نہیں بلکہ عارضی در صلاح و مشورہ کے طور پر ہے اور اس سے زیادہ روک ٹوک تو مصر اور روم میں جاری ہے جہاں اسلامی حکومت ہے۔ کہ مرض طاعون متعدی ہے ایک سے اڑ کر دوسرے کو لگ جاتا ہے۔ موسم حج میں بہت سے لوگوں کا اژدہام ہوگا تو خوف ہے کہ کہیں مری نہ پھیل جائے پس اگر اس کو روک ٹوک سمجھا بھی جائے تو نہ اس لیے ہے کہ لوگ فریضۂ حج نہ ادا کریں بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے ہے کہ حاجیوں

کی جانیں ضائع نہ ہوں۔"[1]

آزاد ہندوستان اور اُس کا حکم

یہاں تک انگریزوں کے زمانے کے ہندوستان کا تذکرہ تھا۔ اب ہمیں موجودہ آزاد ہندوستان کی شرعی حیثیت سے بحث کرنی چاہیے۔ کیونکہ مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری نے خود اس باب میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔ "حضرت شاہ صاحب (مولانا کشمیری) نے اپنی اس تحریر میں سب سے پہلے کسی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کی اصل بنیاد بیان کی ہے فرماتے ہیں باید دانست کہ مدار بودن بلدہ وملکے دارالاسلام یا دارالحرب بر غلبۂ مسلمانان کفار است وبس۔" پھر اس اصول کو دلائل وشواہد اور حوالوں سے مستند و موثق فرمایا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایں اصل را خوب ذہن نشین باید کرد کہ جملہ مسائل از ہمیں اصل برمی آیند و ہمہ جزئیات ایں باب دائر برہمیں اصل ہستند۔"

اس کے بعد اسی اصل پر تفریعات ہیں اور مختلف جزئیات و مسائل بیان فرمائے ہیں اور بعض شبہات کا ازالہ کیا ہے اور آخر میں ہندوستان کی صورتِ حال بتلا کر اس ملک کے دارالحرب ہونے کا حکم ان الفاظ میں بتایا ہے:۔

"بہرحال تسلط کفار بر ہند بداں درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار را بر دارالحرب زیادہ نبودہ۔ و ادائے مراسم اسلام از مسلمانان محض باجازتِ ایشان است واز مسلمانان عاجز تر رعایا کسے نیست۔"

یہ سب کچھ لکھنے لکھانے کے بعد مولانا منت اللہ صاحب غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:۔

"ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریباً چالیس برس پہلے کی ہے جبکہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا۔ اس تحریر میں دارالحرب کے لیے جو اصل بنیاد بتلائی

---

[1] ترجمہ قرآن حاشیہ سورۂ نساء رکوع ۱۴۔

گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جاسکتی ہے۔" (ص ۲)

وہ فیصلہ کن رائے کیا ہے؟ مولانا نے اگرچہ اس کو گول مول رکھا ہے لیکن اس طرح کہ

غیر پھیرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
(غالب)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک ہندوستان دارالحرب ہے۔ پھر امیرِ شریعت بہار اس میں منفرد نہیں ہیں بلکہ سابق جمعیۃ علمائے ہند مولانا محمد میاں کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ ایک تحریر جو بصورتِ افتا ہے اس میں فرماتے ہیں:۔

"یہ ملک (جنوبی افریقہ) یقیناً دارالحرب ہے کیونکہ مسلمان دوسرے اقتدار کے ماتحت ہیں، خود ان کی حکومت نہیں ہے۔ نہ ان کا کوئی ایسا بااختیار شرعی نظام یا کوئی ایسا نواب یا امیر شریعت ہے جس کو حکومت نے مسلمانوں کے معاملات کا اختیار دے رکھا ہو۔ ایسا ملک اصطلاح شریعت میں دارالحرب کہلاتا ہے۔"

اس کے بعد بعض کتب فقہ سے دو ایک عبارتیں نقل کی ہیں، اور پھر لکھتے ہیں:۔

"اگر آپ دار کا ترجمہ اسٹیٹ (ریاست) کرلیں تو دارالاسلام اور دارالحرب کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ غیر مسلم اسٹیٹ کو دارالحرب کہا جاتا ہے اگرچہ وہاں جنگ اور حرب نہ ہو بلکہ مسلمانوں سے صلح ہو یا امن و حفاظت کا کوئی معاہدہ ہو یا اس اسٹیٹ کا قانون ایسا ہو کہ مسلمان اس قانون کے تحت محفوظ رہیں۔ اگر وہ مسلم اسٹیٹ نہیں ہے تو وہ دارالاسلام نہیں ہے۔ بہرحال فقہ کی اصطلاح میں اس کو دارالحرب کہا جاتا ہے۔" (روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۶۶ء ص ۴ کالم ۱)

مولانا محمد میاں کی یہ تحریر اگرچہ جنوبی افریقہ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے لیکن مذکورہ بالا عبارت میں آپ نے دارالحرب کی جو تعریف کی اور اس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ ہندوستان کا حکم بھی آپ کے نزدیک وہی ہے جو

جنوبی افریقہ کا ہے یعنی وہ بھی دار الحرب ہے اور ہندوستان بھی دار الحرب !

دار الافتاء دار العلوم دیوبند

جنوبی افریقہ کی ریاست کے بارے میں ایک سوال نامہ دار العلوم دیوبند میں بھی موصول ہوا تھا۔ یہاں کے دار الافتاء کی طرف سے اس کا جو جواب گیا ہے اور جس پر مولوی محمد جمیل الرحمٰن نائب مفتی اور مفتی محمود احمد الصدیقی دونوں کے دستخط ہیں اور تاریخ یکم شعبان ۱۳۸۶ھ درج ہے۔ اس میں بھی کم وبیش وہی بات کہی گئی ہے جو مولانا محمد میاں نے کہی ہے اور اس سے بھی استنباط یہی ہوتا ہے کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

"آپ کی (یعنی سائل کی) تحریر کے مطابق جمہوریہ افریقہ میں مسلمان اقل قلیل ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ جمہوریہ میں غلبہ وتسلط غیر مسلموں کا ہے اور یہی مدار ہے دار الحرب ہونے کا"[1]

دار الحرب سے متعلق اوپر جو اقتباسات وبیانات نقل کیے گئے ہیں اُن کو بیک نظر دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی ملک کے دار الحرب ہونے کا دار ومدار اس ملک میں غیر مسلموں کی اکثریت اور ان کے استیلاء وتسلط پر ہے۔ لیکن معاملہ فی نفسہٖ اس قدر آسان نہیں کہ دو چار عبارتیں فقہاء کی نقل کرکے اور اس پر دو تین جملے لکھ کر ختم کردیا جائے۔ اس بناء پر ہم اس موضوع پر تفصیل سے بحث وگفتگو کریں گے اور اس سلسلے میں پہلے یہ دیکھیں گے کہ

(۱) فقہاء کے نزدیک دار الحرب کی کیا تعریف ہے۔ اس کی کیا پہچان ہے اور کیا خصوصیات ہیں؟

(۲) دار کی کتنی قسمیں ہیں؟ اور ان اقسام میں باہم کیا نسبت ہے؟ اس کے بعد اس پر غور کریں گے کہ موجودہ زمانے میں جبکہ قومیت اور وطنیت کا ایک نیا تصور پیدا ہوا ہے اور دنیا کی تمام مسلم اور غیر مسلم حکومتیں قومی اور بین الاقوامی معاملات میں اسی جدید تصور پر ملکی دساتیر حکومت پر عمل پیرا ہورہی ہیں، اسلامی تعلیمات واحکام کی رو سے ان ممالک کا شرعی حکم کیا ہوگا۔ جب یہ مرحلہ طے ہوجائے گا تو ہندوستان کے دستور اور اس کے نظام حکومت کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا

---

[1] ماہنامہ الرحیم پاکستان بابت جون ۱۹۶۶ء ص ۴۸

بہت آسان ہو جائے گا کہ آزاد ہندوستان مسلمانوں کے لیے شرعی طور پر کس قسم کا دار ہے اور مسلم ممالک کے لیے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

دار الحرب کی تعریف اور اس کی خصوصیات

کتب فقہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہا کے ذہن میں دار الحرب دو قسم کے تھے ۔ ایک وہ ملک جو شروع سے دار الحرب بنے چلے آرہے ہیں اور ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوا ۔ اور دوسرے وہ ممالک جن کے حالات بدلتے بدلتے رہے ہیں یعنی کبھی ان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور کبھی غیر مسلموں کا ۔ اور جیسا کہ ساتویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ محمد بن محمود الاستروشنی نے لکھا ہے ۔ دراصل یہ دوسرے قسم کے ہی ممالک ہیں جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ گئے تھے ۔ جن کے باعث فقہا کو دار الحرب اور دار الاسلام کی تعریف کر کے ان کی حد بندی کرنی پڑی ۔[1]

ہندوستان اگر دار الحرب ہے تو ظاہر ہے کہ پہلی قسم کا تو ہرگز ہو ہی نہیں سکتا ، لا محالہ دوسری قسم کا ہی ہو گا ۔ اب ملاحظہ فرمایئے کہ فقہا کے نزدیک اس دار الحرب کی کیا تعریف اور اس کی کیا خصوصیات ہیں :-

امام ابو حنیفہ اور صاحبین کا اختلاف

اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ اور صاحبین دونوں آپس میں مختلف ہیں ۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی ملک پر مشرکین کا قبضہ ہو جائے اور وہ اس میں احکام شرک ظاہر کرنے لگیں تو وہ ملک دار الحرب بن جاتا ہے ۔ لیکن امام ابو حنیفہ اس پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ آپ کے نزدیک کسی ملک کے دار الحرب بن جانے کے لیے اُس میں تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے ۔ امام صاحب اور صاحبین کی یہ رائے فقہ حنفی کی سب ہی مشہور کتابوں میں مذکور ہے ۔ ہم صرف مبسوط للسرخسی سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں :-

---

[1] کتاب الفصول ج ۱ ورق ۲ مخطوطہ دار العلوم دیوبند ۔ مصنف جن کا انتقال ۶۳۲ھ میں ہوا ہے ۔ ماوراء النہر کے اکابر مجتہدین و فقہا میں سے تھے ۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جو بڑی پایہ کی سمجھی جاتی ہیں ۔ ان کا تذکرہ کشف الظنون ص ۲۸۰ میں ہے ، اور مولانا عبد الحی لکھنوی نے الفوائد البہیہ مطبوعہ مطبع مصطفائی لکھنؤ میں صفحہ ۲۰۰ و ۲۰۱ پر بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے ۔

والحاصل أن عند أبي حنيفة إنما تصير دارهم دار الحرب بثلاث شرائط أحدها أن تكون متاخمة أرض الترك ليس بينها وبين أرض الحرب دار للمسلمين الثاني أن لا يبقى فيها مسلم آمن بأمانه ولا ذمي آمن بأمانه. الثالث أن يظهروا أحكام الشرك فيها وعن أبي يوسف ومحمد إذا أظهروا أحكام الشرك فيها فقد صارت دارهم دار حرب[1]

غرض کہ ابو حنیفہ کے نزدیک غیر مسلموں کا ملک تین شرطوں سے دارالحرب بنتا ہے (۱) ایک یہ کہ یہ ملک تاتاریوں (اس وقت تک یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے) کے ملک سے ملا ہوا ہو یعنی اس ملک اور ارض حرب میں مسلمانوں کا کوئی ملک نہ ہو۔ (۲) دوسری یہ کہ اس میں کوئی مسلمان سابق امان کے ساتھ نہ ہو اور اسی طرح کوئی ذمی سابق امان کے ساتھ نہ ہو۔ (۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ لوگ شرک کے احکام ظاہر کریں، اس کے برخلاف ابو یوسف اور ابو محمد کے نزدیک احکام شرک کے ظاہر کرتے ہی یہ ملک دارالحرب بن جاتا ہے۔

اس عبارت اور اسی جیسی دوسری عبارتوں سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ صاحبین کے نزدیک محض احکام شرک کے اظہار سے ملک دارالحرب بن جاتا ہے اور اس کے برخلاف امام ابو حنیفہ کی رائے میں کوئی ملک اس وقت تک دارالحرب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں شرائط سہ گانہ ایک ساتھ نہ پائی جائیں اس بنا پر یہ اختلاف حقیقی ہے اور چونکہ امام صاحب کے شرائط سہ گانہ میں خود صاحبین کی شرط داخل ہے اس لیے ان دونوں مسلکوں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے یعنی جو ملک امام صاحب کے مسلک پر دارالحرب ہوگا وہ صاحبین کے مسلک پر بھی ہوگا۔ لیکن جو ملک صاحبین کے نزدیک دارالحرب ہو ضروری نہیں ہے کہ امام صاحب کے نزدیک بھی ایسا ہی ہو لیکن اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اختلاف حقیقی نہیں بلکہ صرف نزاع لفظی ہے، کیونکہ صاحبین محض اظہار احکام شرک کو جو دارالحرب ہونے کی بنیاد قرار دیتے ہیں تو یہ مطلق نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر شخص کو مذہب کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمان

---

[1] المبسوط للسرخسی ج ۱ ص ۱۱۴ باب المرتدین۔

بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان میں بھی تھی، اور اس حد تک تھی کہ اورنگ زیب عالمگیر ایسے متقشف اور متصلب فی الدین فرمانروا کے خزانۂ شاہی سے مندروں کے لیے باقاعدہ گھی اور تیل مہیّا کیا جاتا تھا اور مندروں کے پجاریوں اور پنڈتوں کے ماہانہ وظیفے اور روزینے مقرر تھے۔ چند سال ہوئے صرف ایک شہر اجین میں عالمگیر کے ایسے چالیس فرمان دستیاب ہوئے تھے جن میں وہاں کے مہنتوں اور پنڈتوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ پس جب احکام شرک کا ظہور اسلامی حکومت کے ماتحت دارالاسلام میں بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے تو احکام شرک کا مطلقاً اظہار دارالحرب ہونے کی بنیاد کیونکر قرار پا سکتا ہے؟ اس بنا پر لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ اظہار احکام شرک سے صاحبین کی مراد اہلِ شرک کا قہر و غلبہ اور ایسا استیلاء و استبداد ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی شعائر پر قائم رہنے اور مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی آزادی نہ رہے اور وہ اس معاملہ میں مقہور و مغلوب ہو جائیں۔ امام صاحب نے اظہار احکام شرک جو اُن میں اور صاحبین میں مشترک شرط ہے۔ اس کے علاوہ باقی جو دو شرطیں اور مقرر کی ہیں وہ درحقیقت اسی استیلاء یا قہر و غلبۂ اہلِ شرک کی علامتیں ہیں نہ کہ مستقل کوئی دو جداگانہ چیزیں۔ اس تجزیہ کے بعد یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ امام صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ دراصل اسی ایک چیز کی توضیح اور تشریح ہے جسے صاحبین نے صرف ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہی اسی فتوے زیر بحث میں فرماتے ہیں :-

الحاصل ایں اصلِ کلی و قاعدۂ کلیہ
است کہ دارالحرب مقہور کفار است
و دارالاسلام مقہور اہلِ اسلام اگرچہ
در یک دار دیگر فریق ہم موجود باشد
بلا غلبہ و قہرش آں جا کہ قہر ہر دو فریق
باشد آن ہم دارالاسلام خواہد بود[۱]

ترجمہ

خلاصہ یہ ہے کہ قاعدۂ کلیہ اس باب میں یہ
ہے کہ دارالحرب وہ ہے جو مقہور کفار ہو اور دارالاسلام
وہ ہے جو مقہور اہلِ اسلام ہو۔ اگرچہ ایک دار
میں دوسرے دار کے لوگ بھی بدون غلبۂ قہر
کے آباد ہوں اور جس ملک پر دونوں فریق کا
تسلط ہو وہ بھی دارالاسلام ہی سمجھا جائے گا۔

۱؎ فیصلۃ الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام ص ۴ د ۵

اس عبارت سے نتیجہ یہ نکلا کہ ملک تین قسم کے ہیں :۔

(الف) جس پر غیر مسلموں کا ایسا قبضہ ہو کہ مسلمانوں کو اس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔

(ب) جس پر مسلمانوں کا ایسا قبضہ ہو کہ غیر مسلموں کو اس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔

(ج) جس پر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو اقتدار اور تسلط حاصل ہو۔

ان تینوں میں پہلا ملک دار الحرب ہوگا اور باقی دونوں دار الاسلام کہلائیں گے۔

استیلاء تام کی حقیقت

پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ دار الحرب ہونے کا دار و مدار غیر مسلموں کے استیلاء تام اور ان کے بے شرکت غیرے غلبہ و قہر پر ہے تو اب دیکھنا یہ چاہیے کہ فقہاء کے نزدیک اس استیلاء اور غلبہ و قہر کا تحقق کب ہوتا ہے؟ اور اس کا معیار کیا ہے؟

فقہا نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ استیلاء صرف اس صورت میں متحقق ہوتا ہے جبکہ ملک کے نظم و نسق میں مسلمانوں کو کوئی کسی قسم کا عمل دخل نہ ہو اور ان کو مذہبی آزادی بھی حاصل نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کو نظم و نسق میں دخل ہے یا دخل تو نہیں ہے لیکن مذہبی آزادی بہر حال حاصل ہے۔ ان دونوں صورتوں میں استیلاء متحقق نہیں ہوگا اور اس بنا پر وہ ملک شریعت کی اصطلاح میں دار الحرب نہیں کہلائے گا۔

اب ہم فقہاء کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جن سے ہم نے استیلاء کے مفہوم اور حقیقت کی تعیین و تشخیص میں یہ جو کچھ کہا ہے اس کی تائید ہوگی۔ بدائع الصنائع میں ہے:

إن الامان ان كان للمسلمين فيها على الاطلاق والخوف للكفرة على الاطلاق فهي دار الاسلام وان كان الامان فيها للكفرة على الاطلاق والخوف للمسلمين على الاطلاق فهي دار الكفر[1]	اگر ملک میں مسلمانوں کو مطلق امان اور کفار کو مطلق خوف ہو تو وہ دار الاسلام ہے اور اگر اس کے برعکس مکمل امان کفار کو ہو اور مطلق خوف مسلمانوں کو تو وہ دار الحرب ہے۔

---

[1] جلد ۷ ص ۱۳۱

یہ صورت ہوئی استیلائے تام کی۔ اب لیجیے وہ دو صورتیں جن سے اس کی نفی ہوتی ہے۔

تو ان میں سے پہلی یہ ہے کہ نظم ونسق میں دخل ہو، اس سلسلہ میں ردالمحتار میں ہے:۔

لو اجریت احکام المسلمین	اگر مسلمانوں اور اہل شرک دونوں کے
واحکام اهل الشرك لا تكون	احکام جاری ہیں (یعنی وہاں کی حکومت
دار حرب [1]	مشترکہ ہے) تو وہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مذکورہ بالا عبارت میں صرف حکومت یا اقتدار میں شرکت کا ذکر ہے اس چیز کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ شرکت کس درجہ کی ہے۔ اس بنا پر اگر کسی ملک میں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو تب بھی وہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا!

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی جو جنگ آزادی میں جمعیۃ علما کے سب سے بڑے سپہ سالار اور میر کارواں تھے اس وسوسہ یا شبہ سے کیونکر خالی الذہن ہو سکتے تھے؟ چنانچہ آپ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتوے پر کلام کرتے ہوئے صاف لفظوں میں تحریر فرمایا کہ:

"اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہر حال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لیے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔"[2]

اب رہی دوسری صورت یعنی یہ کہ مسلمان نظم ونسق مملکت میں کوئی عمل دخل نہ رکھتے ہوں لیکن ان کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو ایسے ملک کے دارالحرب نہ ہونے کا اولین ماخذ ہجرت حبشہ ہے جو نبوت کے پانچویں برس وقوع پذیر ہوئی تھی۔ یہاں مسلمان مہاجرین ومہاجرات کو جو امن وامان اور آرام واطمینان ملا صحابہ کرام نے اس پر تشکر کا اظہار اس طرح کیا کہ انھیں

---

[1] جلد ۳ ص ۲۷۵

[2] نقش حیات ج ۲ ص ۱۱

دنوں میں نجاشی کے ملک پر کسی دشمن نے حملہ کیا اور خود نجاشی اس کے لیے میدان میں اُترا تو ان صحابہ نے نجاشی کی فتح کے لیے دعا کی اور جنگ کے لیے خود اپنی خدمات پیش کیں۔[1] اس کے علاوہ ایک دوسرا ماخذ یہ ہے کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ہمیں کسی قبیلہ سے جنگ کرنے کے لیے بھیجتے تھے تو ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ اگر تمہیں اس قبیلہ میں کوئی مسجد نظر آئے یا وہاں سے اذان کی آواز سنائی دے تو اس پر حملہ نہ کرنا۔[2]

ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قبیلہ کے ساتھ غزوہ کرنے کے لیے اپنے آدمی بھیجے ہیں اس کی عظیم اکثریت غیر مسلموں پر ہی مشتمل ہوگی۔ پھر اگر اس آبادی سے اذان کی آواز آتی یا وہاں کی کوئی مسجد نظر آتی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اکا دکا مسلمان بھی آباد ہیں اور انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔ محض اس بنا پر حضورؐ کا اس قبیلہ کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا حکم دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان تعداد میں کتنے ہی کم ہوں، لیکن اگر ان کو مذہبی آزادی حاصل ہے تو اب یہ علاقہ "دارالحرب" نہیں رہا۔ ان دونوں ماخذوں کا اطلاق ان علاقوں پر ہوتا ہے جو اب تک دارالاسلام نہیں بنے ہیں، لیکن جو علاقہ ایک مرتبہ دارالاسلام بن چکا ہے اس کے دارالحرب نہ بننے کے ثبوت میں فقہا نے ان دو ماخذوں کے علاوہ دو دلیلیں اور پیش کی ہیں، ایک یہ کہ جب حکم کا وجود کسی علت پر مبنی ہوتا ہے تو جب تک وہ علت بالکلیہ مرتفع نہیں ہو جائے گی حکم مرتفع نہیں ہوگا۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلی۔ اس بنا پر جس ملک میں بھی اسلامی زندگی کے تھوڑے بہت آثار و علائم موجود ہیں وہ دارالحرب نہیں ہو سکتا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کو ذہن میں رکھ کر اب آپ خود فقہا کی زبان سے ان کے بیانات سُنیئے :۔

سرخسی فرماتے ہیں: امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایک ملک جو دارالاسلام رہ چکا ہے وہ دارالحرب

---

[1] سیرۃ النبی، مولانا شبلی ج ۱ ص ۲۴۰

[2] مسند امام احمد بن حنبل ترتیب ساعاتی ج ۱۴ ص ۵۹۔ یہ روایت بخاری، ابو داؤد اور ترمذی میں بھی سند کے اختلاف کے ساتھ ہے۔

اس وقت بنتا ہے جبکہ وہاں مشرکین کو مکمل قہر اور غلبہ ہو۔ اور مکمل قہر اور غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہاں ایک مسلمان یا ذمی بھی مامون نہ ہو۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

ان بقی فیہا مسلمٌ او ذمی آمنٌ فذالك دلیل عدم تمام القہر منہم [۱]

اگر اس ملک میں ایک مسلمان یا ذمی بھی مامون (بامانِ سابق) ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ مشرکوں کو اس ملک میں مکمل قہر و غلبہ حاصل نہیں ہے۔

صاحب در منتار ملتقی الابحر کی شرح میں لکھتے ہیں:

ولا تصیر دار الاسلام دار الحرب الا بامورٍ ثلاثة: باجراء احکام الشرك۔ وباتصالها بدار الحرب وبان لا یبقی فیها مسلمٌ او ذمی بالامان الاول [۲]

اور کوئی دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں تین چیزیں ایک ساتھ نہ پائی جائیں (۱) وہاں احکام شرک جاری ہوں۔ (۲) وہ دارالحرب سے متصل ہو (۳) اور اس میں ایک مسلمان اور ذمی بھی امانِ سابق سے مامون نہ رہتا ہو۔

محمد بن محمود الاستروشنی لکھتے ہیں:-

وابو حنیفة یقول: ان هذه البلدة صارت دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فیها فما بقی شیءٌ من احکام الاسلام فیها یبقی دار الاسلام علی ما عرف ان الحکم اذا ثبت بعلة فما بقی شیءٌ من احکام العلة یبقی الحکم ببقائه [۳]

اور ابو حنیفہ فرماتے ہیں: یہ ملک احکام اسلام کے جاری ہونے سے دارالاسلام ہو گیا تھا تو اب جب تک اس میں اسلام کا کوئی ایک حکم بھی موجود ہے، وہ دارالاسلام ہی رہے گا۔ کیوں کہ یہ معلوم ہے کہ جب کوئی حکم ثابت ہو جاتا ہے تو جب تک علت کا کچھ حصہ بھی باقی رہتا ہے اس کی بقاء سے حکم بھی باقی رہتا ہے۔

---

۱ المبسوط للسرخسی باب المرتدین ج ۱۰ ص ۱۱۴۔

۲ الدر المنتقی فی شرح الملتقی مخطوطہ دار العلوم دیوبند ص ۲۵۵۔

۳ کتاب الفصول ۱۶ ا ورق مخطوطہ دار العلوم دیوبند۔

اس کے بعد شرح سیر الاصل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام ابوبکر رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ:

ان دار الاسلام یصیر دار الحرب
اذا بقی شیٔ من احکام الاسلام
وان زالت غلبة اهل الاسلام

دار الاسلام اس وقت تک دار الحرب نہیں
ہو سکتا جب تک اس میں اسلامی احکام میں سے
کچھ بھی باقی ہو۔ اگرچہ اہل اسلام کا غلبہ نہ رہا ہو۔

پھر صدر الاسلام ابوالیسر کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ:

ان دار الاسلام لا یصیر دار الحرب
مالم یبطل جمیع ما به صارت
دار الاسلام

دار الاسلام اس وقت تک دار الحرب
نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب چیزیں فنا
نہ ہو جائیں جن کے باعث وہ ملک دار الاسلام بنا تھا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

وذکر شیخ الاسلام الاسبیجابیؒ
فی مبسوطه ان دار الاسلام
محکومةٌ بکونها دار الاسلام فیبقی
هذا الحکم ببقاء حکم واحد فیها
وذکر الامام اللامسی فی واقعاته
ان صارت دار الاسلام بهذه الاعلام
الثلاثة فلا تصیر دار الحرب ما بقی
شیٔ منها۔ وذکر الشهید الامام
الاجل ناصر الدین فی المنشور
ان دار الاسلام صارت دار الاسلام
باجراء احکام الاسلام فما بقیت
علقةٌ من علائق الاسلام ترجح
جانب الاسلام وذکر فی الملتقط

اور شیخ الاسلام الاسبیجابیؒ نے اپنی
مبسوط میں بیان کیا ہے کہ جب دار الاسلام پر دار الاسلام
ہونے کا حکم لگ گیا تو اب اگر ایک اسلامی حکم بھی
باقی رہے گا تو یہ دار الاسلام ہونے کا حکم بھی
باقی رہے گا اور امام لامسی نے اپنے واقعات
میں بیان کیا ہے کہ ایک ملک جب تینوں علامتوں
کے باعث دار الاسلام ہو گیا تو اب جب تک
ان علامتوں کا ایک شمہ بھی باقی ہے یہ ملک
دار الحرب نہیں ہو گا۔ اور شہید امام اجل ناصر الدین نے
منشور میں لکھا ہے کہ ایک ملک جو احکام اسلام
کے اجراء سے دار الاسلام بن گیا ہے تو جب تک
کسی قسم کا لگاؤ اس کو اسلام سے رہے گا
جانب اسلام کو ہی ترجیح رہے گی اور انھیں نے

ان البلاد التی فی ایدی الکفار لاشك انها بلاد الاسلام لا بلاد الحرب لانها غیر متاخمة لبلاد الحرب ولانهم لم یظهروا فیها احکام الکفر[1]

ملتقط میں بیان کیا ہے کہ جو علاقے کفار کے قبضہ میں ہیں وہ بے شبہ اسلامی علاقے ہیں نہ کہ حربی۔ کیوں کہ یہ علاقے بلاد حرب سے متصل نہیں ہیں اور پھر ان علاقوں کے حکمرانوں نے ان میں احکام کو غالب نہیں کیا ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں میں آپ نے ملاحظہ فرمایا فقہائے کرام برابر یہ کہتے جا رہے ہیں کہ اگر اسلام کا ایک حکم بھی باقی رہے گا تو ملک دار الحرب نہیں ہوگا، اب یہ بھی سن لیجیے کہ یہ ایک حکم جس کا بقا "عدم اظہار کفر" کی دلیل ہے فقہا کے نزدیک اس کا معیار اور اس کی حد کیا ہے؟ شیخ محمد بن محمود الحنفی الاستروشنی فرماتے ہیں:

یجوز فیه اقامة الجمعة والاعیاد وتزویج الایامی[2]

اس ملک میں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا اور بیوہ عورتوں کا نکاح کرنا جائز ہو۔

اسی سلسلہ میں فتاوی بزازیہ میں ہے:

واما البلاد التی علیها ولاة کفار فیجوز فیها ایضاً اقامة الجمع والاعیاد والقاضی قاضٍ بتراضی المسلمین وقد تقرر ان ببقاء شیٔ من العلة یبقی الحکم وقد حکمنا بلا خلاف فان هذه الدیار قبل استیلاء الکفار کان من دیار الاسلام وبعد استیلاءهم اعلان الاذان والجمع والجماعات والحکم بمقتضی الشرع والفتوی والتدریس شائع بلانکیر

اور جن علاقوں پر حاکم کفار ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا گوارا ہے اور خود مسلمانوں کی آپس کی رضامندی سے وہاں قاضی بھی ہے اور یہ ثابت ہے کہ علت کے ایک جز کے بقا سے حکم باقی رہتا ہے اور ہم نے بلا خلاف کے یہ حکم کیا تھا کہ کفار کے استیلا سے پہلے یہ علاقے دار الاسلام تھے اور ان کے استیلا کے بعد اذان دینا، جمعہ اور جماعت اور شریعت کے مطابق حکم دینا، فتویٰ دینا اور درس دینا عام طور پر مروج اور کفار بادشاہو

---

[1] کتاب الفصول ج ۱ ورق ۲ ۔ [2] ایضاً

من ملوکهم فالحکم بانها من
دار الحرب لاجهة له نظراً الى
الدراسة والدراية. واعلان بيع
الخمور واخذ الضرائب والمكوس
والحكم من النقص برسم التتار كاعلان
بني قريظة باليهودية وطلب
الحكم من الطاغوت في مقابلة
محمد صلى الله عليه وسلم
في عهده بالمدينة ومع ذالك
كانت بلدة اسلام بلا ريب[1]

کی طرف سے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے
اس بنا پر ان علاقوں کو دار الحرب کہنے کی کوئی
وجہ نہ عقلی ہے اور نہ نقلی اور شراب کا کھلم کھلا
بیچنا اور خراج لینا اور ٹیکس وصول کرنا اور تاتاریوں
کی رسم کو توڑنا ان سب کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ
بنو قریظہ کا اعلانِ یہودیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے مقابلہ میں طاغوت سے حکم کا طلب کرنا
حضور کے عہدِ مدنی میں اور بلا شبہ ان
سب چیزوں کے باوجود مدینہ بلاشبہ اسلام کا
شہر تھا۔

فقہائے کرام کی ان تمام تصریحات کو سامنے رکھنے سے جو نتیجہ بلا کسی دغدغہ اور خدشہ کے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ صرف وہ ملک دار الحرب ہوگا جہاں کفر کا غلبہ اور استیلا بایں معنی ہو کہ نہ تو مسلمان اس کی حکومت اور نظم ونسق میں شریک ہوں اور نہ ان کو مذہبی آزادی حاصل ہو یعنی یہ دونوں چیزیں استیلاء وغلبہ کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اس بنا پر یہ دونوں نہ ہوں یا ان میں سے ایک نہ ہو بہر حال فوت الجزء فوت الکل کے قاعدہ کے مطابق استیلا متحقق نہیں ہوگا اور اس لیے حسب ذیل دونوں قسم کے ملک دار الحرب نہیں ہوں گے:

(الف) وہ ملک جس میں مسلمان شریک حکومت ہیں۔

(ب) وہ ملک جس میں مسلمان شریک حکومت تو ہیں نہیں البتہ انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔

احتمال عقلی کے طور پر ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان شریک حکومت تو ہیں مگر ان کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے لیکن ہم نے اس صورت کا ذکر قصداً اس لیے نہیں کیا کہ اگر واقعی کسی ملک میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو مذہبی آزادی کے نہ ہونے کے باوجود حکومت میں شریک ہیں

---

[1] بحوالہ اردو ترجمہ مجموعۃ الفتاوی مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحی لکھنوی جلد اول ص ۱۲۴

تو وہ سچ مچ اس شعر کا مصداق ہیں :۔

اپنے ہاتھوں سے جو ڈھا آئیں خدا کے گھر کو — ننگ اسلام ہے ایسوں کا مسلماں ہونا

اور ظاہر ہے اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ملک دار الحرب ہے یا دار الاسلام !

ہندوستان کی دستوری پوزیشن

اب آئیے ہندوستان کی دستوری پوزیشن کا جائزہ لیں۔ اس پر غور کرنے سے پہلے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے آزادی کے اس پس منظر کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ ملک کی آزادی کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں ایک ساتھ ایک عرصہ تک سرگرم عمل رہے۔ دونوں نے یکساں قربانیاں دیں، جیل گئے، پٹے اور مارے گئے، جمعیۃ علما جو علمائے ہند کی نمائندہ جماعت تھی اس نے آخر دم تک کانگریس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور یہ سب کو معلوم ہے کہ کانگریس کا نصب العین آزادی کے بعد جمہوری نظام قائم کرنا شروع سے رہا ہے اور علما اس پر مہر تصدیق ثبت کرتے رہے ہیں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے بعد علمائے کرام کے نزدیک ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہوتی ؟ وہ دار الحرب رہتا یا دار الاسلام ؟ اگر دار الحرب ہوتا تو کیا علما کے لیے جائز تھا کہ وہ ایک ایسے ملک کو جو (انگریزوں کے زمانہ میں) دار الحرب نہیں تھا اسے عظیم الشان قربانیاں دے کر دار الحرب بنائیں ؟ اور اگر وہ دار الاسلام بنتا تو پھر تقسیم نے ملک میں اکثریت و اقلیت کے اعتبار سے آخر ایسی کونسی بنیادی تبدیلی پیدا کی ہے جس کے باعث ملک اگر تقسیم نہ ہوتا تو دار الاسلام ہوتا اور اب تقسیم ہو گیا ہے تو یہ دار الحرب بن گیا۔ آخر دستوری طور پر وہ کون سی چیز ہے جو تقسیم نہ ہونے کی صورت میں ہوتی اور اب نہیں ہے اور اس بنا پر پہلی صورت میں شرعی حکم کچھ اور ہوتا اور اب کچھ اور ہو گا! صوبائی طور پر آبادی کم و بیش ہوتی لیکن مرکز میں پوزیشن تو بہر حال یہی ہوتی جس کا ذکر مسلم لیگ بار بار کرتی تھی۔

بہر حال کانگریس اور مسلم لیگ میں فرقہ وارانہ مسائل پر سمجھوتہ نہ ہو سکا اور انجام کار دو قومی نظریہ پیدا ہوا اور اس کی بنیاد پر ہی ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اسی بنیاد پر پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دیا گیا تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد ہندو مسلمانوں میں جو نہایت شدید قسم کی منافرت، دشمنی اور عداوت پائی جاتی تھی وہ اور پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں

جن کے پیش نظر غالباً یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہوتی! لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں پارلیمنٹری نظام جمہوریت اختیار کیا گیا۔

جمہوریت — اس نظام کے ماتحت ہر شخص جو ہندوستانی ہے مذہب، ذات پات، رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود یکساں شہری حقوق رکھتا ہے۔ پیشوں میں، ملازمتوں میں، عہدوں میں، غرض کسی ایسی چیز میں جس کا تعلق اسٹیٹ سے ہے مذکورہ بالا چیزوں میں سے کسی کی بنیاد پر کوئی کسی قسم کا امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا، ہر شخص جو بالغ ہے اس کو رائے دینے کا حق ہوگا۔ شہری حقوق اس ملک کے ہر باشندہ کو یکساں طور پر حاصل ہوں گے۔ عام حق رائے دہندگی (ADULT FRANCHISE) کے ذریعہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا انتخاب ہوگا۔ اور یہی پارلیمنٹ اور اسمبلیاں گورنمنٹ بنائیں گی، اور اس طرح جو گورنمنٹ بنے گی اس کی تشکیل میں تمام اہالیان ملک کا دخل ہوگا۔ گویا اصل طاقت بلا اختلاف مذہب و ملت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں حکومت کے منصب پر بٹھا سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے الگ بھی کر سکتے ہیں۔

مذہبی آزادی — اب لیجیے مذہبی آزادی! اس سلسلہ میں دستور اعلان کرتا ہے کہ

(۱) ہندوستان کے سب لوگوں کو مساویانہ طور پر عقیدہ (CONSCIENCE) کی آزادی کا حق ہوگا اور ان کو اس بات کا حق بھی ہوگا کہ وہ آزادی کے ساتھ جس مذہب کو چاہیں مانیں، اس پر عمل کریں اور اس کی تبلیغ کریں۔

(۲) ہر مذہبی فرقہ یا طبقہ کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مذہبی اور خیراتی کاموں کی خاطر (الف) ادارے قائم کریں اور چلائیں۔ (ب) مذہبی معاملات میں اس کا وہ خود انتظام کریں (ج) اس ادارہ کے لیے منقولہ یا غیر منقولہ جائداد حاصل کریں۔ (د) اور اس جائداد کا انتظام قانون کے مطابق وہ خود کریں [۲]

جب یہ دفعات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوئیں تو اقلیتی فرقوں کے نمائندوں کی طرف

---

(1) THE CONSTITUTION OF INDIA PART III ARTICLES 14-8

(2) PART III - ARTS 25,26

سے ان کا بڑے جوش وخروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ ایک صاحب نے فرمایا "جناب! یہ ہے اکثریت کا وہ عادلانہ اور مساویانہ برتاؤ جو اقلیتوں کو ان کے ساتھ دو قالب و یک جان بنا دے گا۔" ایک اور صاحب نے کہا: "میں اکثریتی فرقہ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اقلیتی فرقوں کے ساتھ بڑے عدل اور انصاف سے کام لیا ہے۔"[1]

دستور نے صرف یہی اعلان نہیں کیا ہے کہ ہر شخص کو مذہبی عقائد و اعمال اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی ہوگی بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ "حکومت مذہب کے معاملہ میں بالکل غیر جانبدار ہوگی اور اس بنا پر حکومت کے فنڈ سے جو تعلیمی ادارے چلیں گے اُن میں کسی مذہب کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا۔"[2]

اقلیتوں کو طبعی طور پر یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ان کے بچے حکومت کے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا کر کہیں ارتداد (INDOCTRINATION) کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس دفعہ سے اس اندیشہ کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سپریم کورٹ

اب سوال یہ ہے کہ دستور ہند نے باشندگان ملک کو جو یہ حقوق دیے ہیں ان کی حفاظت و نگرانی کون کرے گا۔ اور پھر اگر کسی دفعہ کی یا اس کے کسی لفظ کی مراد اور اس کی تشریح میں اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ جواب یہ ہے کہ دستور نے یہ سب اختیارات سپریم کورٹ کو دیے ہیں۔[3] اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت اور پارلیمنٹ یہ سب دستور کے وفادار اور اس کے پابند ہیں اور دستور کی تشریح و توضیح اور ظلم و زیادتی سے اس کی حفاظت یہ سب سپریم کورٹ کا حق ہے اور اس بنا پر گورنمنٹ بھی مجبور ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں انڈین سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس آنریبل کوکا سبا راؤ (COKA SUBBA RAO) نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ "سپریم کورٹ کا فرض یہ ہے کہ

---

[1] CONSTITUENT ASSEMBLY DELEATES VOLUM VII PAGES 260-267

[2] ARTICLE 28

[3] ARTICLE 32

دستور نے جو بنیادی حقوق دیے ہیں کورٹ ان کے اور سماجی انصاف کے درمیان تطبیق و توافق رکھے اور ہیئت منتظمہ (حکومت) کو راہ سے بے راہ نہ ہونے دے۔" اسی بنا پر سپریم کورٹ کے لیے غیر جانبدار اور بے خوف ہونا ضروری ہے۔[51]

دستور کا عملی پہلو

اب غور کیجیے۔ دستور کی دفعہ جو شہری حقوق سے متعلق ہے وہ مسلمانوں کو حکومت کے کاروبار میں اکثریت کے ساتھ شریک کرتی ہے اور مذہبی آزادی سے متعلق جو دفعہ ہے وہ ان کو مذہبی عقائد و اعمال اور مذہبی شعائر و رسوم کو بجا لانے کی، مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی، مذہبی تعلیم اور دینی امور کو سرانجام دینے کی غرض سے خود اپنے ادارے قائم کرنے اور ان کو حکومت کی مداخلت کے بغیر چلانے کی پوری آزادی دیتی ہے۔ شہری حقوق میں معاشی آزادی بھی شامل ہے اور اس لیے مسلمانوں کو اس بات کی بھی پوری آزادی حاصل ہے کہ حصول معاش کے لیے وہ جو پیشہ چاہیں اختیار کریں، ملازمت، صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت ان میں سے ہر ایک کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے اور کسی اعتبار سے کہیں کسی جگہ اکثریت و اقلیت میں کوئی کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے، چنانچہ جہاں تک حکومت میں مسلمانوں کی شرکت کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ صدر جمہوریہ اکثریت کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں تو نائب صدر ایک مسلمان ہے۔ اسی طرح مرکز اور ریاستوں کی وزارتوں میں، سفارتوں میں، گورنروں میں، حکومت کے دفاتر میں چھوٹے ہوں یا بڑے، پارلیمنٹ میں، اسمبلیوں، عدالتوں میں، کارخانوں اور کمپنیوں میں، یونیورسٹیوں میں، ہر جگہ مسلمان موجود ہیں، حکومت کی تشکیل میں ان کے ووٹ کا بھی دخل ہوتا ہے، بلکہ بعض علاقوں میں تو ان کا ووٹ پاسنگ کی حیثیت رکھتا یعنی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اب رہی مذہبی آزادی! تو اس آزادی کی کون سی قسم ہے جو انھیں حاصل نہیں ہے۔ ملک میں لاکھوں مسجدیں ہیں جہاں سے پانچوں وقت اذان کی آواز بلند ہو کر فضا میں گونجتی ہے۔ بعض بڑے بڑے شہروں کی خاص خاص مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا ہے اور اس پر اذان ہوتی ہے، عید، بقرعید اور بعض اور مسلم تہواروں کی تعطیل حکومت کے کیلنڈر میں شامل ہے۔ ہر سال حج کے لیے کم و بیش سترہ اٹھارہ ہزار مسلمان حج کو جاتے ہیں اور اس

---

51 DAILY STATESMAN, 28 TH JUNE, 1966, P.5.

مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لیے سہولتیں پیدا کرنے کے سلسلہ میں گورنمنٹ وہ سارے کام کرتی ہے جو اسلامی حکومتیں کرتی ہیں۔ حکومت کی مقرر کردہ دو مرکزی حج کمیٹیاں ہیں۔ جدہ میں ہندوستانی سفارت خانہ پورے عملہ کے ساتھ حاجیوں کی دیکھ بھال اور ان کی خدمت کرتا ہے۔ مکہ اور مدینہ میں اور حج کے دنوں میں منیٰ اور عرفات میں ڈاکٹروں، لیڈی ڈاکٹروں اور دواؤں کا انتظام ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف صوبوں سے حجاج کی عام خدمت کے لیے اسکاؤٹس الگ جاتے ہیں، اس سال زرمبادلہ کے سخت گھاٹے کے باوجود حکومت نے دو کرور روپیہ کا ایکسچینج حاجیوں کے لیے منظور کیا، پھر مسلمانوں کی مذہبی اور دینی تعلیم بالکل آزاد ہے، ملک میں چھوٹے بڑے سیکڑوں مدارس عربیہ اور ہزاروں مکاتب دینیہ ہیں جو بغیر کسی مداخلت کے اپنا کام کر رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند جس کا بجٹ تقسیم سے پہلے اسّی نوے ہزار ہوتا تھا اس سال اس کا بجٹ دس لاکھ روپیہ کا ہے۔ علاوہ ازیں حیدرآباد کا دائرۃ المعارف، جو اسلامی علوم وفنون کی اشاعت کا سب سے اہم ادارہ ہے وہ اور اس کے علاوہ کلکتہ، پٹنہ اور رامپور وغیرہ کے مدارس عربیہ تمام تر حکومت کے خرچ اور اس کے انتظام سے چل رہے ہیں۔ سنسکرت کی طرح عربی اور فارسی کے کسی ایک اسکالر کو بھی ہر سال صدر جمہوریہ کی طرف سے اعزاز ملتا ہے تبلیغی جماعت، اسلامی جماعت اور دینی تعلیمی کونسل سب اپنے اپنے طریقہ پر کام کر رہی ہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں۔

تقریر اور تحریر کی آزادی

ہمارا دستور اظہار مافی الضمیر کی گارنٹی دیتا ہے تو مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ یہاں کا مسلم پریس جس آزادی اور بے باکی کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات ومسائل اور ان کی شکایات وتکالیف کے بارے میں لکھتا اور حکومت پر تنقید کرتا ہے۔ بلاشبہ عرب اور افریقہ کے بہت سے مسلم ممالک کے اخبارات یہ جرأت و جسارت نہیں دکھا سکتے۔

معاشی آزادی

دستور معاشی آزادی کی جو ضمانت کرتا ہے مسلمان اس سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ملک میں گھوم پھر کر دیکھیے اللہ کے فضل وکرم سے صنعت وحرفت، تجارت، زراعت وفلاحت ان میں سے کوئی شعبہ نہیں ہے جس میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہو اور وہ ترقی نہ کر رہے ہوں۔ تقسیم کے بعد بتاشہ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ لیکن اب وہ ایک نئی توانائی اور خوداعتمادی

کے ساتھ ابھر رہے ہیں۔ ان کے اپنے مل بھی ہیں اور کارخانے بھی۔ بعض خاص خاص صنعتوں کے دائرہ میں اب تک ان کے نام کا سکہ چلتا ہے، ان میں کروڑپتی بھی ہیں اور لکھ پتی بھی، چھوٹے دکان دار بھی ہیں اور بڑے بھی، مال درآمد بھی کرتے ہیں اور برآمد بھی، پھر کثرت سے فارم اور باغات والے بھی ہیں جو اپنے یہاں کی خصوصی پیداوار پر گورنمنٹ سے کئی کئی انعام لے چکے ہیں۔

شکایات

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے شکایات بھی ہیں اور بعض بہت شدید قسم کی۔ لیکن منطق کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہم ایک سالبہ بناتے ہیں اور وہ یہ کہ "مسلمانوں کے ساتھ کوئی انصاف نہیں ہو رہا ہے" لیکن کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کلیہ صحیح ہے۔ پس جب یہ صحیح نہیں تو لامحالہ اس کی نقیض یعنی موجبہ جزئیہ صحیح ہوگی اور اب یہ قضیہ یہ ہوگا کہ "مسلمانوں سے کچھ انصاف ہو رہا ہے اور کچھ نہیں ہو رہا ہے"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مکمل انصاف اور دستور پر مکمل عمل کس کے حق میں ہو رہا ہے؟ آج آپ کو معلوم ہے ملک کا کیا حال ہے؟ کون سی بیماری ہے جو ہمارے سماج میں نہیں ہے۔ کون سا آزار ہے جس میں ہمارا معاشرہ مبتلا نہیں۔ روگ کی وہ کون سی قسم ہے جو قوم کے رگ و پے میں سماری نہیں۔ آدمی پاگل ہوتا ہے تو ماں، باپ، اور بہن بھائی پر بھی ہاتھ اٹھا بیٹھتا ہے۔ پس مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اُن کو ملک کے عام حالات کے پس منظر کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔ مسلمان ایک کُل کا جز ہیں۔ جب کل ہی صحت مند نہیں تو جز صحت مند کیسے ہو سکتا ہے۔ ملک کے مختلف طبقات میں اگر ذات پات کے، زبان کے اور علاقائی حدبندی کے تعصبات پائے جاتے ہیں اور ان کی بنیاد پر آئے دن شکست و ریخت اور حرب و ضرب کے ہنگامے برپا رہتے ہیں تو اگر مذہب کے نام پر بھی مفسدہ پردازوں کے ایک گروہ نے من مانی کرنے کی ٹھان لی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ بہر حال ملک کی عام ناگفتہ بہ اور تباہ کن صورت حال کے اصل اسباب حکومت کی نااہلیت اور کمزوری اور عوام میں جمہوریت کی قدروں کا عدم احساس یہی دو ہیں۔ کم و بیش کا فرق ہے۔ لیکن مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اس کے اسباب بھی یہی ہیں، اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمانوں کو جو شکایات ہیں وہ محض اس لیے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں!! معاشرہ میں جب تک فساد ہے مسلمانوں کو بحیثیت ایک فرقہ کے کامل اطمینان کبھی نہیں

ہو سکتا۔ معاشرہ جب سدھر جائے گا تو مسلمانوں کو بھی اطمینان ہو جائے گا اور مسلمانوں کو یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے آپ کو سدھار لیں تو معاشرہ کے سدھارنے میں بھی وہ ایک بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں دستور نے جو حقوق مسلمانوں کو دیے ہیں ان پر اگر کہیں زد پڑتی ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا یہ مسلمانوں کا آئینی حق ہے وہ انھیں کرنا چاہیے اور وہ کرتے بھی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ نہ بھولیے کہ احتجاج کے حق کا آئینی ہونا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اس ملک کے شہری حقوق میں کسی سے کم نہیں، بلکہ برابر ہیں، مغلوب نہیں بلکہ شریک ہیں، محکوم نہیں بلکہ ساتھی ہیں۔

اندیشے اور خدشے

شکایات کے علاوہ بعض اندیشے اور خدشے بھی ہیں۔ مثلاً بعض مسلمان کہتے ہیں کہ بے شبہ اس وقت تو مسلمانوں کو مذہبی آزادی مکمل طور پر حاصل ہے لیکن دستور میں ایک دفعہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسٹیٹ تمام ملک میں ایک ہی سول قانون رائج کرنے کی کوشش کرے گی[1] اگر ایسا ہوا تو مسلمانوں کے پرسنل لا کا کیا ہوگا؟ اور پھر مذہبی آزادی کہاں رہے گی؟ جواب یہ ہے کہ اول تو پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب میں وزیر قانون اعلان کر چکے ہیں کہ سول کوڈ کسی فرقہ پر زبردستی تھوپا نہیں جائے گا۔ علاوہ ازیں آپ کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ ملک کے لیے جو عام سول کوڈ بنے گا وہ اسلامی قوانین کے خلاف ہی ہوگا۔ ممکن ہے وہ اسلام کے مطابق ہو جیسے ہندو کوڈ بل میں متعدد دفعات اسلامی تعلیمات کا چربہ ہیں۔ اور پھر اگر اس میں کوئی بات مسلم پرسنل لا کے خلاف ہوئی بھی تو آپ کو پورا حق ہے اس کے خلاف آواز اٹھانے اور اگر ضرورت ہو تو سپریم کورٹ کو کھٹکھٹانے کی! یہ یاد رکھیے یہ حق سب مسلم ممالک میں بھی نہیں ہے۔

بہر حال فقہا نے دار الحرب کی تعریف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اور پھر ہندوستان میں دستوری طور پر مسلمانوں کو جو پوزیشن حاصل ہے ان سب کو پیشِ نظر رکھا جائے تو حسب ذیل تنقیحات پیدا ہوتی ہیں:

---

[1] PART IV ARTICLE 44

(۱) ہندوستان چوں کہ ایک سکولر جمہوری ملک ہے اس لیے یہاں کسی مذہب یا کسی مذہبی فرقہ کی حکومت نہیں ہے اس بنا پر فقہا کی اصطلاح میں "غلبۂ کفر" یہاں صادق نہیں آتا۔

(۲) شہری حقوق میں یکساں ہونے کے باعث مسلمان حکومت میں شریک ہیں۔

(۳) مذہبی آزادی کی دفعہ کے تحت مسلمانوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے۔

(۴) مسلمانوں کو معاشی اور تقریر و تحریر کی آزادی بھی حاصل ہے۔

(۵) انڈین یونین کے ڈپلومیٹک تعلقات تمام اسلامی ملکوں سے ہیں۔ اس کے علاوہ دوستانہ تعلقات و مراسم بھی ہیں کسی سے کم کسی سے زیادہ۔

(۶) انڈین یونین کی شمال مغربی سرحد مسلم ممالک سے متصل ہے۔ لاہور سے لے کر مراکو تک یہ سلسلہ چلا گیا ہے۔

ان تنقیحات کی روشنی میں یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ دارالحرب ہونے کے جو شرائط ہیں اور جو ایک لفظ "استیلا" میں جمع ہو گئے ہیں (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) ان میں سے چونکہ کوئی ایک شرط بھی نہیں پائی جاتی اس لیے ہندوستان ہرگز ہرگز دارالحرب نہیں ہے اور نہ اس جیسا کوئی اور جمہوری ملک جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو دارالحرب ہو سکتا ہے۔

یہ مسئلہ اس درجہ صاف اور واضح ہے کہ اور تو اور پاکستان کے دو نامور محقق اور فاضل اسلامیات نے بھی یہی لکھا ہے۔ چنانچہ جنوبی افریقہ کے متعلق استفتا اور دارالعلوم دیوبند کے دارالافتا کی طرف سے اس کا جواب (جس کا ان صفحات میں ذکر آ چکا ہے) پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر صغیر احمد معصومی ہندوستان اور اسی جیسی دوسری جمہوریتوں کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں:-

"دارالحرب کی جو تعریف بیان کی گئی ہے۔ نیز قرونِ اولیٰ میں دارالحرب و دارالاسلام کے جو تعلقات تھے اور جو جنگی نتائج مرتب ہوتے تھے۔ ان سب پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آج کل کی سلطنتوں اور ریاستوں کو جہاں بد نظمی نہیں بلکہ ایک خاص نظام قائم ہے اور مسلمان با امن و امان رہتے ہیں بلکہ اپنی تعداد کے مطابق سیاسی امور میں بھی حصہ لیتے ہیں دارالحرب قرار نہیں دیا جا سکتا۔"[۱]

---

[۱] ماہنامہ الرحیم حیدرآباد (مغربی پاکستان) بابت جون ۱۹۶۶ء ص ۱۰۷-۴۷

دوسرے صاحب پروفیسر محمد شریف مرحوم ہیں جنھوں نے لکھا ہے :-

"ہندوستان کا دستور اگرچہ سیکولر ہے لیکن اس میں عقیدہ، عمل اور مذہب کی جو آزادی دی گئی ہے وہ بعینہٖ وہ ہے جو اسلام دیتا ہے۔ اس بنا پر لفظوں کا فرق ہے ورنہ پاکستان کی اسلامی ریاست اور ہندوستان، اسٹریلیا اور امریکہ کی سیکولر اسٹیٹ یہ سب ایک ہی ہیں"[1]

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان دارالحرب نہیں ہے تو کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں جو دو مغالطے پیش آتے رہے ہیں انھیں دور کر دیا جائے:

دارالاسلام اور دارالحرب میں نسبت کون سی ہے؟

پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اسلام میں دار دو ہی ہیں۔ ایک دارالاسلام اور دوسرا دارالحرب اور ان دونوں میں نسبت تناقض کی ہے۔ یعنی اگر کوئی ملک دارالاسلام نہیں ہے تو وہ دارالحرب ضرور ہوگا اور اسی طرح اگر وہ دارالحرب نہیں تو لازمی طور پر دارالاسلام کہلائے گا۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر غلط فہمی ہے جو ہمارے علماء کو شروع سے آج تک پیش آتی رہی ہے اور اسی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن ممالک پر درحقیقت نہ دارالحرب کی تاریخ صادق آتی ہے اور نہ دارالاسلام کی (مثلاً انگریزوں کے زمانہ کا ہندوستان کہ اس میں مذہبی آزادی اور معاشی آزادی تو تھی لیکن اسلام کا قانون نافذ نہ تھا) ان کے متعلق علماء میں اختلاف پیدا ہوگیا، کسی نے ان کو دارالحرب کہا اور کسی نے دارالاسلام اور کسی نے کوئی ایک دوٹوک بات کہنے سے انکار ہی کر دیا، حالانکہ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں میں نسبت تناقض کی نہیں جو ایک کا ارتفاع دوسرے کے وجود کو مستلزم ہو، بلکہ یہ دونوں وجودی ہیں اور اس بنا پر ان میں تضاد کی نسبت ہے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ملک دارالحرب بھی ہو اور دارالاسلام بھی۔ البتہ ایک ملک ایسا ہو سکتا ہے کہ نہ دارالحرب ہو اور نہ دارالاسلام۔

کیا دارالعہد والامن دارالحرب کے اقسام ہیں

دوسرا مغالطہ جو دراصل پہلے مغالطہ کا ہی شاخسانہ اور

---

[1] ISLAMIC AND EDUCATIONAL STUDIES. P. 6.
(INSTITUTE OF ISLMIC CULTURE, LAHORE)

نتیجہ یہ ہے کہ دارالحرب سے ہجرت ضروری نہیں ہے۔ کیوں کہ دارالحرب دارالامان بھی ہوسکتا ہے اور دارالعہد بھی۔ چنانچہ مولانا محمد سہول سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا گنگوہی کے مذکورۃ الصدر فتوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارالامان ہے۔ یعنی جس طرح حبشہ قبل ہجرت شریف کے باوجود دارالحرب ہونے کے دارالامان تھا اسی طرح سے آجکل ہندوستان بھی دارالامان ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت ضروری نہیں ہے۔"

اس دعوی کے ثبوت میں فتح الباری اور اشعۃ اللمعات سے دو عبارتیں نقل کرنے کے بعد بطور حاصل بحث کے لکھتے ہیں :۔

"خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سب سے اول مدینہ منورہ ہی دارالاسلام بنا ہے اور اس کے قبل دو ہی قسم کے دارالحرب تھے۔ دارالامان جیسے حبشہ اور دارخوف وشر جیسے مکہ مکرمہ!" [1]

یہی رائے مولانا محمد میاں مرادآبادی کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"غیر مسلم اسٹیٹ کو دارالحرب کہا جاتا ہے۔ اگرچہ وہاں جنگ اور حرب نہ ہو بلکہ مسلمانوں سے صلح ہو یا امن وحفاظت کا کوئی معاہدہ ہو یا اس اسٹیٹ کا قانون ایسا ہو کہ مسلمان اس قانون کے ماتحت محفوظ رہیں۔ اگر وہ اسٹیٹ نہیں ہے تو دارالاسلام نہیں ہے۔"

اس کے بعد حبشہ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"لیکن ہر دارالحرب سے نکل جانا ضروری نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ صحابہ کو حبشہ بھیج دیا تھا، حالانکہ وہ بھی دارالحرب تھا۔ مگر وہاں مسلمانوں کو امن مل جاتا تھا" [2]

---

[1] فیصلۃ الاعلام فی دارالحرب ودارالاسلام، آخری صفحہ

[2] اخبار الجمعیۃ دہلی مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۶۶ء ص ۴

مولانا نجم الدین اصلاحی جنھوں نے مکتوبات شیخ الاسلام کو مرتب کیا اور اس پر فاضلانہ حواشی لکھے ہیں انھوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"دار حرب کی دو قسمیں ہیں، دار الامن اور دار الفرار (اصل کتاب میں غلطی سے قرار چھپ گیا ہے) دار الامن وہ ہے کہ اس میں مسلمان بادشاہ اور اسلامی قوانین نہیں ہیں، لیکن مسلمان وہاں عبادت میں آزاد ہیں جیسے ہندوستان یا صلح حدیبیہ کے بعد مکہ معظمہ۔ دار الفرار وہ ہے جس جگہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی نہ ہو ۔۔۔۔ خلاصہ یہ کہ دار الحرب کے اقسام میں سے دار الامن ہے جس کو دار السلم بھی کہہ سکتے ہیں"[1]

اب ذرا غور کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے یہ اصطلاح بنا لی ہے کہ وہ آگ کو برف اور برف کو آگ کہے گا تو بات دوسری ہے، کیونکہ لامشاحۃ فی الاصطلاح ورنہ سچی بات یہ ہے کہ دار الامان اور دار السلم کو دار الحرب کی قسم قرار دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ آگ کی قسم ایک ایسی بھی ہے جو جلاتی نہیں ہے۔ یا ایلوہ کی قسم ایک ایسی ہے جو کڑوی نہیں ہوتی۔ حرب و قتال اور سلم و امان (WAR AND PEACE) دونوں متضاد ہیں، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک موضع میں بیک وقت دونوں کا اجتماع ہو جائے۔ اگر کسی چیز کو بیک وقت آپ سیاہ اور سفید اور کسی عورت کو بیک وقت بیوی اور اجنبیہ نہیں کہہ سکتے تو بے شبہ ایک ملک کو دار الحرب اور دار الامان معاً بھی نہیں کہہ سکتے، اصل یہ ہے کہ دار الامان اور دار العہد دار الحرب کی قسمیں نہیں ہیں، بلکہ قسیم ہیں، اور اس بنا پر دار کی دو قسمیں نہیں ہیں بلکہ چار ہیں یعنی (۱) دار الاسلام (۲) دار الحرب (۳) دار الامان (۴) دار العہد، اور چونکہ یہ باہم قسیم ہیں اس لیے ایک قسم دوسری قسم کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

غلط فہمی کی بنیادی وجہ

اس غلط فہمی کی بنیادی وجہ ایک اور عام غلط فہمی ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی معاشرتی تعلقات کے بارے میں ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ چونکہ اسلام اور کفر میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی اور یہ دونوں طبیعت اور فطرت کے

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۱ ص ۱۶۹ (حاشیہ)

اعتبار سے باہم متحارب ہیں اس بنا پر جس ملک میں کفر کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا وہ طبعی طور پر دار الحرب ہی ہوگا، لیکن حق یہ ہے کہ دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں، ایک ہے نفس ایمان اور کفر کا باہمی تعلق اور دوسری ہے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دنیوی اور معاشرتی تعلقات اور روابط۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور ان میں مسالمت یا مصالحت ممکن نہیں ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات و روابط کا تعلق ہے تو اس میں بڑی وسعت ہے، اس کے متعدد اقسام و انواع ہیں اور معاشرتی و سماجی زندگی میں اسلام غیر مسلموں کے ساتھ بھی وہی اعلیٰ اخلاق و فضائل برتنے کا حکم دیتا ہے جن کا حکم وہ مسلمانوں کے ساتھ برتنے کا دیتا ہے، اسلام وحدت انسانیت کا بھی داعی ہے اور مساواتِ انسانی کا بھی، جس طرح اسلام کا خدا رب العالمین ہے اسی طرح اس کا پیغمبر رحمۃ للعالمین ہے۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کو اصلاً باہم متحارب اور عہد و صلح کو ایک "امر عارض" قرار دیا جائے اور اسی ایک بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جائے کہ غیر مسلموں کا ملک اصلاً "دار الحرب" ہوگا۔ اس فرق کو آپ اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ شرک کو قرآن نے نجاست کہا ہے مگر مشرک کو جسمانی اور مادی اعتبار سے نجس کوئی نہیں کہتا، چنانچہ اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور ایک ہی مکان میں رہنا سہنا سب جائز ہے۔

ہم نے اوپر دار کی جو چار قسمیں بیان کی ہیں ان میں پہلی قسم یعنی دار الاسلام تو خارج از بحث ہو چکا ہے اب رہیں باقی تین قسمیں تو اب ہم قرآن مجید اور تاریخ و سنت سے ان کا ثبوت پیش کرتے ہیں:۔

اس سلسلہ میں ہمیں امور ذیل پر غور کرنا چاہیے:۔

(الف) از روئے قرآن غیر مسلموں کے ساتھ اصل حرب یا صلح و آشتی۔ اسی کو آج کل کی اصطلاح میں ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام پُر امن حیاتِ باہم (PEACEFUL CO-EXISTENCE) یا "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" (LIVE AND LET LIVE) کا قائل ہے یا نہیں۔

(ب) اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو قرآن میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی کتنی

قسمیں ہیں؟ اگر ایک نہیں بلکہ کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور کوئی قسم کسی دوسری قسم کی تابع نہیں تو اس سے خود بخود یہ ثابت ہو جائے گا کہ تعلقات کی جتنی قسمیں ہیں اتنی ہی غیر مسلم ممالک کی قسمیں ہوں گی اور وہ سب مستقل بالذات ہوں گی۔

پُرامن بقائے باہم

اب آیئے پہلے اس پر بحث کریں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے سلسلہ میں اصل حرب کو قرار دیتا ہے یا پُرامن بقائے باہم کو، ہر شخص جس نے قرآن پر ایک نظر بھی ڈالی ہے اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن میں فتنہ و فساد، شر انگیزی اور ظلم جگہ جگہ سخت مذمت اور فتنہ انگیزوں کے لیے شدید وعید بیان کی گئی ہے۔ یہاں تک فرمایا گیا:-

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ — فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت (یعنی ناقابل برداشت) ہے

ایک مسلمان اور غیر مسلم میں مذہب کے سوا اور کسی چیز کا اختلاف نہیں ہے۔ اس بنا پر مذہب کی تبلیغ اور اس کی طرف دعوت جس طرح ہر انسان کا ایک طبعی حق ہے مسلمان کا بھی ہے۔

ساری دنیا کا ایک مذہب نہیں ہو سکتا

لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں یاد رکھنے کے لائق ہیں، ایک یہ کہ فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ جس طرح ہر چیز میں یہاں تنوع اور رنگا رنگی ہے اسی طرح مذہب بھی ایک نہیں ہو سکتا اور اس میں اختلاف و تنوع برابر قائم رہے گا۔ چنانچہ حضور پر نور کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

(۱) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ [۱]

اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک امت ہی بنا دیتا اور یہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر تیرے رب نے رحم کیا ہے، اور اسی لیے ان کو پیدا کیا ہے۔

(۲) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ط اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ [۲]

اور اگر تیرا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں وہ سب ہی ایمان لے آتے تو کیا (پھر بھی) آپ لوگوں پر جبر کریں گے یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔

---

[۱] سورۂ ہود ۱۱۸-۱۱۹۔ [۲] سورۂ یونس ۹۹

(۳) وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاۗءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَي الْهُدٰي فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۱؎

اگرچہ ان لوگوں کی روگردانی آپ پر بہت شاق ہے لیکن اگر آپ کے بس میں ہے (تو جائیے) زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان کے لیے کوئی زینہ تلاش کر لیجیے تو ان لوگوں کے لیے ایک نشانی لے آئیے (جسے دیکھ کر سب ایمان لے آئیں) اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر ہی دیتا۔ پس آپ نادان نہ بنیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ عام لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۲؎

اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن خدا نے جو کچھ تمھیں دیا ہے اس میں وہ تمھارا امتحان لیتا ہے اس لیے نیکیوں میں سابقت کرو، خدا ہی کی طرف تم سب کو لوٹ جانا ہے اور پھر (قیامت میں) جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے تھے خدا ان سے تم کو آگاہ کرے گا۔

ان آیات کا منشا یہ ہے کہ جب یہ اختلافِ ادیان و مذاہب بحکمِ مشیت ایزدی قائم و برقرار رہے گا ہی تو تبلیغ و دعوت الی اللہ جو تمھارا فرض ہے وہ انجام دیے جاؤ لیکن محض اختلافِ مذہب کی بنیاد پر کسی سے شخصی مخاصمت اور دشمنی رکھنا دینِ حق کی تعلیم نہیں ہے۔ مرض چھوٹا ہو یا بڑا بہر حال قابلِ نفرت ہے اور اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، لیکن جو شخص آپ کے خیال میں مریض ہے وہ آپ کی نفرت کا نہیں بلکہ ہمدردی کا مستحق ہے۔

مذہب میں جبر و اکراہ نہیں ہے

اور دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات کے پہلو بہ پہلو ہی وہ آیات ہیں جن میں حضورؐ کو خطاب کر کے صاف صاف فرمایا گیا کہ آپ صرف مبلغ ہیں، مذکر ہیں، آپ نہ ان لوگوں پر مسلط ہیں اور نہ آپ ان کے اجارہ دار ہیں پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ مذہب میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہو سکتا۔ حق اور ناحق دونوں وضاحت

۱؎ الانعام ۳۵ ۲؎ المائدۃ آیت ۴۸

کے ساتھ بیان کر دیے گئے۔ اب جس کا جو جی چاہے کرے۔ جو جیسا کرے گا خدا کے ہاں ویسا ہی پائے گا۔ چنانچہ آیاتِ ذیل پر غور فرمایئے:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ إِلَّا مَنْ تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ (الغاشیہ آیت ۲۱)

پس آپ نصیحت کیجیے۔ آپ نصیحت کرنے والے ہی ہیں آپ ان پر مسلط نہیں ہیں مگر ہاں جو شخص سرکشی اور کفر کریگا تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ بے شبہ ہماری ہی طرف ان سب کو آنا ہے اور ہمارے ذمہ ہی ان کا حساب ہے۔

یہ آیات مکی ہیں جب کہ مسلمان کمزور اور تعداد میں بہت کم تھے، لیکن مدینہ میں جب ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ایک عظیم الشان طاقت و قوت کے مالک تھے، وہاں بھی تبلیغ کے سلسلے میں جو احکام نازل ہوئے وہ سب یہی تھے، چنانچہ مدنی آیات ہیں:۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (النور آیت ۵۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو لیکن اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو پھر پیغمبر اپنے بوجھ کا ذمہ دار ہے اور تم لوگ اپنے بوجھ کے؛ اور اگر تم پیغمبر کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاجاؤ گے اور پیغمبر کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچادینا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ آیت ۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے متمائز ہو گئی ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (التوبہ)

اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو اے محمدؐ آپ کہیے: میرے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، میں نے اس پر ہی بھروسہ کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔

اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن میں جبر و اکراہ کی نفی ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ جو ایمان جبر و اکراہ سے قبول کیا جائے اور اس میں دل کی خواہش اور رضامندی کو دخل نہ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ پس جب زبردستی کا ایمان معتبر ہی نہیں ہے تو پھر جبر و اکراہ کی اجازت کیوں ہو سکتی ہے۔ ارشاد حق بنیاد ہے:

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوْا: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(مومن، آیت ۸۵)

پس جب ان لوگوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو تو بولے "ہم ایک خدا پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں کو خدا کے ساتھ ہم شریک مانتے تھے اب ہم ان کا انکار کرتے ہیں"۔ لیکن ہمارا عذاب دیکھنے پر ان کا ایمان لانا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوا۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ دیرینہ سنت یہی ہے اور ایسے موقع پر کافر بہت نقصان اٹھاتے ہیں۔

عذاب الٰہی کی طرح موت بھی ایک جبر ہی ہے اس بنا پر جس طرح نزول عذاب کے وقت ایمان لانا معتبر نہیں تھا اسی طرح موت کے شکنجہ میں پھنس کر ایمان کے اقرار کا کوئی اعتبار نہیں چنانچہ فرمایا گیا:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ

(النساء، رکوع ۳)

اور توبہ اُن بدکاروں کی معتبر نہیں ہوتی جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے: "میں نے اب توبہ کر لی ہے"۔

اگر اسلام میں جبر جائز ہوتا تو سب سے پہلے حضرت عمر رضؓ اپنے غیر مسلم غلام کو مسلمان بناتے۔

اب شر و فساد، ظلم و جور کی مذمت، وحدت انسانیت، مساوات انسانی اور عدل و انصاف کی تاکید کے بارے میں جو آیات ہیں ان کو مذکورہ بالا آیات کے ساتھ ملا کر پڑھیے

تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض اختلافِ مذہب کے باعث غیر مسلموں کے ساتھ ان مکارمِ اخلاق اور فضائلِ علیا سے گر کر معاملہ کرنا جن کا حکم اسلام دیتا ہے جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ بتوں کا سب وشتم، مذاق اُڑانا، پھبتی کسنا، نام بگاڑنا تک جائز نہیں ہے۔ پس جب یہ ہے تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم کو جو مسلم مملکت میں نہیں رہتا اس کو حربی اور اس کے ملک کو بہر حال دار الحرب کہا جائے اسی سے یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام "پرامن بقائے باہم" کا سرگرم حامی اور داعی ہے اور اس کے فلسفۂ حیات میں اصل امن وامان، مصالحت ومسالمت ہے اور جنگ فقط ایک امرِ عارض وزوال پذیر ہے ٹھیک اسی طرح جیسے صحت، خوشی، نیکی زندگی کی اصل حقیقتیں ہیں اور ان کے بالمقابل مرض، درد وغم اور بدی عارضی امور ہیں۔ چنانچہ ایک آیت میں دنیا کے سب لوگوں کے ساتھ امن وامان اور صلح وآشتی کے ساتھ رہنے کا عہد وپیمان کرنے کا حکم صاف لفظوں میں دیا گیا ہے اور اس راہ میں جو وساوس وخطرات پیش آتے ہیں ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○ (البقرہ رکوع ۲۵)	اے ایمان والو! تم سب صلح وآشتی میں داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر مت چلو، وہ بے شبہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

حرب وضرب اور قتال کا حکم

مرض، درد وغم اور بدی امورِ عارضی سہی لیکن بہر یہ بھی اس دنیا کی حقیقتیں ہیں اور جب تک ان سے حفاظت اور بچاؤ اور کم از کم ان پر قابو پانے کا بندوبست نہ ہو زندگی میں سکھ اور چین میسر نہیں آ سکتے، اس بنا پر اگر انسان کے لیے فرشتہ بننا ممکن نہیں ہے تو جنگ بھی ناگزیر [illegible] قرآن میں جنگ کے احکام ومسائل اور اس کے متعلقات کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ جنگ کا مقصد فتنہ وفساد کی بیخ کنی ہے اور یہ فساد خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف اور غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ قرآن نے ان دونوں قسموں کو بیان کر کے ان کے احکام بھی بتائے ہیں، پہلی قسم کے متعلق ارشاد ہے:

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ	اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے

اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ (الحجرات رکوع ۱)

درمیان صلح و صفائی کرا دو، لیکن اگر ایک گروہ نے دوسرے گروہ پر زیادتی کی ہے تو اب تم اس گروہ سے جنگ کرو جو زیادتی کر رہا ہے اور اس وقت تک جب تک یہ گروہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ نہ آئے۔

اس آیت میں مسلمانوں کی باہمی جنگ کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں:۔

(الف) دونوں گروہ کسی غلط فہمی یا اجتہادی خطا کے باعث لڑ رہے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ دونوں میں غلط فہمی رفع کر کے صلح و صفائی کرائی جائے۔

(ب) ایک گروہ حق پر ہے اور دوسرا باطل پر۔ ایک مظلوم ہے اور دوسرا ظالم: اس کا یہ حکم ہے کہ ظالم سے جنگ کی جائے اور اسے انتہا تک پہنچایا جائے۔

اور اگر یہ فساد اور شر غیر مسلموں کی طرف سے ہو تو پھر ان سے بھی جنگ کرنی چاہیے لیکن اسلام کے فلسفۂ اخلاق میں جنگ کی حیثیت "علاج بالمثل" یا "جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا" کی ہے۔ اس بنا پر حکم ہے کہ مقصد جب حاصل ہو جائے تو فوراً ہاتھ روک لو اور ہرگز حد سے قدم آگے نہ رکھو، ورنہ خدا کے ہاں سخت پکڑ ہو گی۔ آیاتِ ذیل ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡمُعۡتَدِيۡنَ (البقرۃ رکوع ۲۴)

اور اللہ کے راستہ میں تم ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ (البقرۃ رکوع ۲۴)

اور جس نے تم پر دست درازی کی ہے تم بھی بس اتنی دست درازی اس پر کرو۔

(۳) وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ ؕ (النحل رکوع ۱۶)

اور اگر تم ان کو عذاب دینے لگو تو بس اتنا عذاب دو جتنا کہ تم کو دیا گیا تھا۔

اس سے بڑھ کر حسن اخلاق، شرافتِ نفس اور لطف و کرم کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگرچہ اس آیت میں برابر سرابر بدلہ لینے کی اجازت ہے، لیکن پھر بھی صبر کا مرتبہ بہت اونچا بتایا گیا ہے:

وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ

اگر تم صبر کرو تو بے شبہ وہ صبر کرنیوالوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔

غیر مسلموں کی قرآن میں تین قسمیں

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام میں جنگ کا مقصد کیا ہے؟ وہ کیوں مشروع کی گئی ہے؟ اور اس کے کیا حدود ہیں؟ تو اب یہ معلوم کرنا چاہیے کہ قرآن میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرنے کے سلسلہ میں جنگ، صلح اور امن کی تین حالتیں بیان کی گئی ہیں، انھیں تین حالتوں کے اعتبار سے ان کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کے لیے الگ الگ احکام ہیں اور انھیں احکام کی وجہ سے غیر مسلم ممالک تین قسم کے دار پر تقسیم ہوتے ہیں۔

اہل مرنج و مرنجان

ایک قسم اُن غیر مسلموں کی ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کا نہ کوئی معاہدہ ہے اور نہ جنگ۔ یہ لوگ مرنج و مرنجان قسم کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں مسلمانوں کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات نہیں ہیں تو یہ ان کے درپے آزار بھی نہیں ہیں۔ یہ نہ خود ستاتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے خلاف کسی سازش میں شریک ہیں مسلمانوں کو صاف حکم ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور لطف و کرم کا معاملہ کریں۔ ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ؀ [۱]	اے مسلمانو! جن لوگوں نے مذہب کی بنیاد پر تم سے جنگ نہیں کی اور تم کو ترک وطن پر مجبور نہیں کیا اللہ تم کو اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا برتاؤ کرو، بے شبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

جو حضرات قرآن کے اسلوب کلام کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس آیت میں اگرچہ لفظ "لا ینھاکم" کے ہیں جس سے محض اباحت و اجازت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے لیکن درحقیقت مراد وجوب ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ایک دو نہیں متعدد مواقع پر "لاجناح" بولا گیا ہے اور وجوب مراد ہے۔ یہی مضمون ایک دوسری آیت بیان کیا گیا ہے۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا	پھر اگر وہ لوگ تم سے دو جانبہ ہوں اور تم سے جنگ

---

[۱] الممتحنہ رکوع ۲

اِلَیْکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ عَلَیْھِمْ سَبِیْلًا ۔ [1]

کریں اور تم سے صلح کے خواہاں ہوں تو خدا تم کو ان پر زور چلانے کی اجازت نہیں دے گا۔

ارباب عہد و صلح

دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جن سے مسلمانوں کا عہد و پیمان ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کے احکام بالکل صاف و صریح یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عہد و پیمان کی پابندی صورت اور معنیٰ دونوں اعتبار سے کرنی چاہیے، عہد شکنی، غدر، خیانت اور فریب دینا پہلے درجہ کے معاصی کبیرہ میں سے ہے بلکہ یہاں تک حکم ہے کہ اگر مسلمانوں کو کبھی بھی اس بات کی بھنک پہنچے کہ غیر مسلم دھوکہ دینے کا ارادہ کر رہے ہیں تو اس وقت بھی اللہ پر بھروسہ کریں۔ اور اپنی طرف سے پہل اس وقت تک نہ کریں جب تک وہم و ظن یقین سے نہ بدل جائے۔

چنانچہ ارشاد ہوا:-

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ۔ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ وَاِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْکَ فَاِنَّ حَسْبَکَ اللّٰہُ ۔ [2]

اور اگر وہ لوگ تم سے صلح کرنے پر آمادہ ہوں تو (اے محمد) آپ ان سے صلح کر لیجئے اور اللہ پر بھروسہ رکھیے، بے شبہ وہ سننے اور جاننے والا ہے اور اگر وہ آپ کو دھوکا دینے کا ارادہ کریں تو آپ (پروا نہ کریں) بس اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰہِ مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ ۭ کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ [3]

اور جو شخص تم سے سلامتی اور صلح کی درخواست کرتا ہے اس سے تم یہ نہ کہو کہ تو ایمان دار نہیں ہے، تم اس دنیا کے سازو سامان کی طلب کرتے ہو درآنحالیکہ اللہ کے پاس بڑی بڑی نعمتیں ہیں تم (اسلام سے پہلے) ایسے ہی (دنیا پرست) تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جو عہد و پیمان ہوتا ہے، خدا نے خود اس کو اپنا عہد کہا ہے، اور اس بنا پر اس پر ثابت قدم رہنے کی سخت تاکید کی ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ اِذَا عٰھَدْتُّمْ

اور جب تم معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو، اور

---

[1] نساء رکوع ۱۲۔ [2] الانفال رکوع ۷، آیۃ ۶۱-۶۲۔ [3] النساء رکوع ۱۳

وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ [1]

قسموں کو مؤکد کرنے کے بعد ان کو نہ توڑو، درانحالیکہ تم نے اپنے اوپر اللہ کو کفیل بنالیا ہے جو کچھ تم کرتے ہو بیشک اللہ اس کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو اور اس عورت کی طرح مت بنو جو اپنا سوت کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کرکے توڑ دے، کہ لگو تم اپنی قسموں کو اس وجہ سے فساد کا سبب بنانے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ طاقتور ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کا حکم اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر ان غیر مسلموں کے خلاف کچھ مسلمان بھی مدد طلب کریں تو حکم ہے کہ ان کی مدد نہیں کرنی چاہیے:۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ [2]

اگر وہ (مسلمان) دین کے معاملہ میں تم سے مدد کے طالب ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے۔ البتہ اُس قوم کے خلاف نہیں جن میں تم اور تم میں عہد و پیمان ہے اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں اگرچہ لفظ "قوم" ہے جس کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم دونوں پر ہو سکتا ہے، لیکن "فی الدین" اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں قوم سے مراد غیر مسلم ہی ہیں، کیونکہ مسلمان دین کے معاملہ میں جس مدد کے خواہاں ہیں وہ غیر مسلموں کے ہی خلاف ہو سکتی ہے۔

ایک اور آیت میں خاص مشرکین سے معاہدہ کا تذکرہ ہے:۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

مگر ہاں جن مشرکین کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہے، پھر

---

[1] النحل ۹۱-۹۲ عہدِ جاہلیت میں قریش کا طریقہ یہ تھا کہ جس قبیلہ کو زیادہ طاقتور پایا اس سے معاہدہ کر لیا اور پھر اگر اس سے بھی زیادہ طاقتور کوئی اور قبیلہ ملا تو اس سے عہد و پیمان کر لیا اور پہلا معاہدہ توڑ دیا، اس آیت میں اس طریقہ کی مذمت اور معاہدہ کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے۔

[2] الانفال: ۷۲

ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ؎	ان لوگوں نے تمہارا کوئی حق کم نہیں کیا ہے اور تمہارے برخلاف کسی کی مدد بھی نہیں کی ہے تو (اے مسلمانو) تم اس معاہدہ کی مدت تک اس کو پورا کرو، بے شک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

مندرجۂ بالا اور ان کے علاوہ دوسری آیات میں مسلمانوں کو معاہدہ کی پابندی کا حکم جس تاکید اور قوت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کس طرح عمل کیا؟ اس کا اندازہ صلح حدیبیہ کے اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ابھی صلحنامہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو کا بیٹا ابو جندل زنجیروں میں گھسٹتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور آپ سے مدد طلب کی، لیکن چونکہ صلحنامہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ مکہ سے اگر مسلمان بھاگ کے ادھر آئے گا تو حضورؐ کے لیے اس کو واپس کر دینا ضروری ہوگا۔ اس بنا پر اگرچہ حضرت عمرؓ جیسے مسلمانوں کو ناگواری ہوئی لیکن حضورؐ نے اس کی ذرا پروا نہ کی اور صلحنامہ کی دفعہ متعلقہ کے مطابق ابو جندل کو اسی حالت میں مکہ واپس کر دیا۔؎

اس موقع پر یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ معاہدہ میں فریقین کا پلڑہ برابر ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا پلڑہ کبھی کمزور بھی ہو سکتا ہے اور کبھی بھاری بھی۔ اول کی مثال یہی صلح حدیبیہ ہے جس کا رنج صحابہ کو عموماً اور حضرت عمرؓ کو خصوصاً اس درجہ تھا کہ اس تاثر کے تحت آپ کی زبان سے چند الفاظ جو بلیاختہ نکل گئے تھے ان کا افسوس عمر بھر رہا۔ اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کا ہی یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ابو رافع ایک قبطی تھے۔ قریش نے گفت و شنید کے لیے ان کو بھی بھیجا تھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو مجھے اسلام کی طرف رغبت محسوس ہوئی اور میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اب میں ہرگز قریش کی طرف واپس نہ جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا:

انی لا اخیس بالعھد ولا احبس البرید ولکن ارجع فان کان فی نفسک الذی فی نفسک الآن فارجع	میں نہ تو عہد شکنی کرتا ہوں اور نہ قاصد کو قید کرتا ہوں اس لیے تم بہر حال واپس جاؤ پھر جو چیز اس وقت تمہارے دل میں ہے وہ اگر لوٹنے کے بعد ہو تو واپس آجانا۔

؎ التوبہ: ۴   ؎ صحیح بخاری

اس ارشاد کے مطابق میں واپس چلا گیا اور اس کے بعد جب موقع ملا خدمتِ گرامی میں حاضر ہوکر اسلام قبول کیا۔[1]

اور دوسری صورت کی مثال وہ مصالحت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہود اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ کی تھی بہرحال مسلمانوں کی پوزیشن کچھ ہی ہو، قرآن کا حکم یہ ہے کہ جب معاہدہ ہے تو اس کی پابندی مکمل طور پر اور ایمانداری سے ہونی چاہیے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل رکوع ۴)	اور اپنا عہد و پیمان پورا کر (قیامت کے دن) اس کے بارہ میں پوچھ گچھ ہوگی۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام نے ان احکام کی پابندی اس طرح کی کہ امیر معاویہ اور اہل روم کے درمیان ایک معاہدہ تھا، جب اس معاہدہ کی مدت قریب ہونے کے قریب آئی تو امیر معاویہ ایک لشکر جرار لے کر اس ارادہ سے روانہ ہوئے کہ معاہدہ کے ختم ہوتے ہی دھاوا بول دیں گے، ابھی یہ لشکر راستہ میں تھا کہ ایک صحابی جن کا نام عمرو بن عبسہ تھا اچانک سامنے کی طرف سے بھاگتے ہوئے یہاں پہنچے اور امیر معاویہ سے بولے: "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جن لوگوں کا کسی قوم سے عہد ہو تو وہ اس کو اس وقت فسخ نہ کریں جب تک معاہدہ کی مدت نہ گذر جائے یا دونوں اس کو برابر سرابر فسخ کرنے پر رضامند نہ ہو جائیں" راوی کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی امیر معاویہ نے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس ہو گئے۔

(سنن ابوداؤد کتاب الجہاد حدیث نمبر ۲۱۹ و ترمذی جلد اول)

دشمنانِ جنگجو

تیسری قسم اس غیر مسلم ملک یا قوم و قبیلہ کی ہے جو نہ غیر جانبدار ہیں۔ اور نہ ان سے مسلمانوں کا کوئی عہد و پیمان ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے درپئے آزار رہتے ہیں، ان کے خلاف سازشیں کرتے اور گھر سے بے گھر کرتے ہیں، یہ لوگ قرآن کی اصطلاح میں "ارباب اعتداء" ہیں اعتداء دو قسم کا ہوتا ہے ایک بالقوۃ اور دوسرا بالفعل، اگر اعتدار بالقوۃ ہو یعنی اگرچہ مسلمانوں پر ابھی تک کوئی حملہ نہیں ہوا ہے، لیکن ناقابلِ تردید ذرائع سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حملہ کی تیاریاں ہو رہی

---

[1] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الجہاد حدیث نمبر ۲۱۸

ہیں تو قرآن میں حکم یہ ہے کہ اس کے جواب میں مسلمان بھی غافل نہ رہیں بلکہ پوری مستعدی اور بیدار مغزی کے ساتھ عصری آلات حرب فراہم کرنے کی حسب استطاعت تیاری کریں۔ ارشاد ہے:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال ۶۰)	اور مہیا کرو اُن سے جنگ کرنے کے لیے وہ سب کچھ طاقت اور گھوڑے جو تمہارے امکان میں ہو، تاکہ تم ان کے ذریعہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کرو۔

یہی وہ دشمن ہیں جن کی نسبت ایک اور مقام پر فرمایا گیا:۔

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً (النساء ۱۰۲)	جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اسے پسند کرتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور ساز و سامان سے غافل ہو تو یہ لوگ تم پر اچانک حملہ کر دیں۔

اسی سلسلہ میں یہ آیت بھی ہے جس میں ارشاد ہوا:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید ۲۰)	بے شبہ ہم نے اپنے پیغمبر کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے، تاکہ لوگ انصاف قائم کریں، اور ہم نے لوہا اُتارا ہے جس میں سخت رعب داب ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔

یہ سب کچھ اعتدِا بالقوۃ کے سلسلہ میں تھا! اب رہی اعتدا کی دوسری قسم اعتدا بالفعل یعنی مسلمانوں پر سچ مچ دھاوا بول دیا گیا اور ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ہے تو اب قرآن کا حکم یہ ہے کہ تم ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرو، اور ان کو شکست دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرو، یہی وہ دشمنانِ جنگ جو ہیں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے:۔

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ	جن لوگوں نے (اے مسلمانو) تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تم کو گھروں سے نکالنے پر تمہارے دشمنوں کی مدد کی ہے اللہ تم کو ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے سختی کے ساتھ

يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ
(الممتحنہ ۲)

منع کرتا ہے اور جو ان کے ساتھ دوستی کرے گا دراصل ظالم وہی ہو گا۔

اسلام اور مسلمانوں کے یہی وہ دشمن اور حریفانِ نافرجام ہیں جن سے جنگ کرنے پر قرآن کی متعدد آیات میں مسلمانوں کو برانگیختہ کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں فرمایا گیا :۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ
وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا
أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ
أَهْلُهَا (نساء رکوع ۱۰)

اے مسلمانو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کے لیے اور ان کمزور مردوں اور بچوں کی خاطر جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہم کو اس آبادی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں۔

علاوہ ازیں قوم شمویل سے نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا :۔

قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ
دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا (بقرہ رکوع ۳۲)

ان لوگوں نے (اپنے نبی سے کہا) "ہم خدا کی راہ میں کیوں نہ لڑیں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور اولادوں سے جدا کیے گئے ہیں۔

حرب وقتال کے سلسلہ میں یہ وہ آیات ہیں جو محرکات و بواعث جنگ کو متعین کرتی ہیں۔

ان سب کا خلاصہ اس آیت میں کر دیا گیا ہے :۔

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ
الطَّاغُوتِ (النساء آیۃ ۷۶)

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے راستہ میں قتال کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ شیطان کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں۔

یہ اللہ کا راستہ (سبیل اللہ) کیا ہے؟ قرآن نے اس کو مبہم نہیں رکھا۔ یہ نیکی اور احسان ضعیفوں اور کمزوروں کی مدد، دفع شر، رفع جور و ظلم، استیصال فتنہ و فساد، اور اقامت امن و امان کی راہ ہے۔ اب جب جنگ چھڑ جائے تو حکم ہے کہ مسلمان بہادروں کی طرح لڑیں اور اس وقت تک نچلے نہ بیٹھیں جب تک شر و فساد کے بچھو کا ڈنک نہ مارا جائے، اس سلسلہ میں اس نوع کی آیات ہیں :۔

کیا ہے[۱]۔ ذرا غور کیجیے تو یہ استدلال بیچ مچ ایسا ہی ہے "لکم دینکم ولی دین" اور فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ سے یہ ثابت کرنا کہ قرآن دین کے معاملہ میں ہر شخص کو اختیار دیتا ہے کہ وہ جو دین چاہے اختیار کرے۔

بہرحال قرآن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ذی استطاعت مسلمانوں کے لیے دار الحرب میں سکونت اختیار کرنا حرام ہے اور جو ایسا نہیں کرتے ان کے لیے جہنم کی وعید شدید ہے۔ البتہ اس کے علاوہ جو اور دار ہیں یعنی دار الامان اور دار العہد ان میں رہنا بسنا اور توطن جائز ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے! اس کا دفع کرنا بھی ضروری ہے۔ اشکال یہ ہے کہ جب قرآن سے چار قسم کے دار ثابت ہوتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ کتب فقہ میں عام طور پر دار الاسلام اور دار الحرب صرف ان ہی دو داروں کا ذکر ملتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ مشہور یہ دو دار ہی ہیں لیکن امام شافعی اور امام محمد بن الحسن ایک تیسرا دار بھی مانتے تھے۔ چنانچہ السیر الکبیر میں امام محمد نے اس کا تذکرہ کر کے اسے دار موادعت بھی کہا ہے اور دار العہد بھی۔ شیخ ابو زھرۃ اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"ہمارے لیے یہ کہنا بالکل ممکن ہے کہ دار العھد دار حرب نہیں ہوتا۔ اور اگرچہ اس پر بعض احکام دار الاسلام کے بھی جاری ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ایک مستقل بالذات دار ہوتا ہے"[۲]

لیکن یہ جواب رفع اشکال کے لیے کافی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے، جیسا کہ شیخ ابو زہرہ نے لکھا ہے:

"جو زمانہ اجتہاد اور فقہ کی تدوین و ترتیب کا تھا اس میں صورت حال یہ تھی کہ عملاً تین قسم کے ہی دار تھے، ایک دار الاسلام، دوسرا دار الحرب اور تیسرا

---

[۱] روزنامہ الجمعیۃ دہلی مورخہ ۲ مئی ۱۹۶۱ء صفحہ ۴ کالم ۲

[۲] مقالہ "العلاقات الدولیۃ فی الاسلام" مطبوعہ الازہر بابت مارچ ۱۹۶۱ء ص ۲۸۰

دار العہد، چوتھا دار یعنی ان لوگوں کا ملک جو ناطرفدار اور غیر جانبدار ہوں وہ ناپید تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ اس زمانہ میں جو غیر مسلم حکومتیں مسلمانوں کے اطراف واکناف میں تھیں، ان کی ریشہ دوانیوں کے باعث مسلمان ان کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے اس بنا پر مسلمان ان حکومتوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ عہد و پیمانِ امن کریں، اور اگر یہ منظور نہیں ہے تو اب ان کے لیے اسلام یا جنگ یہ صرف دو راہیں کھلی ہوئی ہیں جس کو چاہیں اختیار کرلیں۔" ؎۱

یہی بات عہدِ حاضر کے نامور عالم اور محقق شیخ عبد القادر عودہ نے کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"اسلامی نظریات جو تمام بلادِ اجنبیہ کو ایک دارِ حرب قرار دیتے ہیں۔ باوجودیکہ ان کی حکومتیں مختلف ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان۔ ترکستان۔ روس ہند، اسپین۔ فرانس اور روم ان سب ملکوں کی حکومتوں سے جنگ کر رہے تھے۔ اس بنا پر وہ ان سب ملکوں کو اور ان کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی دارِ حرب کہتے تھے۔" ؎۲

اس بنا پر ہمارے علماء کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ عہد بنی عباس کے اوائل میں فقہائے کرام نے دار کی جو تقسیم کی اور اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ اس زمانہ کے مخصوص وقتی اور مقامی حالات کا نتیجہ ہے جب کہ جنگ کی بنیادی وجہ مذہب ہوتا تھا اور اسی بنیاد پر مسلمان ایک عالمگیر جنگ سے دوچار تھے۔ یہ حالات کا دباؤ کس قدر شدید ہوتا اور فکر و نظر کے سانچے اور پیمانے کس طرح بدل دیتا ہے؟ اس کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ فرمائیے :

حالات کے دباؤ کی ایک عجیب مثال صلح حدیبیہ کے ذکر کے سلسلے میں آپ اوپر ابو رافع قبطی کا واقعہ پڑھ آئے ہیں کہ یہ قریش کی طرف سے سفیر بن کر آئے تھے،

؎۱ مقالہ "العلاقات الدولیۃ فی الاسلام" مطبوعہ الازہر بابت۔ مارچ ۱۹۵۸ء ص ۲۷۶

؎۲ التشریع الجنائی الاسلامی جلد اول ص ۲۹۱

لیکن حضور انورؐ کو دیکھتے ہی انھوں نے اسلام کو قبول کرنا چاہا، اور عرض کیا کہ اب میں قریش کی طرف واپس نہیں جاؤں گا۔ لیکن حضورؐ نے ان کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی۔ انھیں واپس کر دیا اور فرمایا "میں نہ بد عہدی کرتا ہوں اور نہ قاصدوں کو حبس کرتا ہوں" اس واقعہ کو اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید میں وفائے عہد کے جو احکام بڑی تاکید کے ساتھ ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر سوچیے کہ اس طرح کا معاملہ جب کبھی پیش آئے تو اس وقت اسلامی حکومت کا عمل کیا ہونا چاہیے؟ حضورؐ چونکہ ہر معاملہ میں ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں اس بنا پر یقیناً اسلامی حکومت کو وہی کرنا چاہیے جو اس واقعہ میں آپؐ نے کیا۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ امام ابو داؤد اپنی سنن میں اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ھذا کان فی ذالک الزمان والیوم لا یصلح	یہ اس زمانہ میں تھا مگر آج یہ مناسب نہیں ہے۔

اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟ اسے شارح سنن ابی داؤد کی زبان سے سنیے۔ فرماتے ہیں:

والمراد بھذا الکلام ان من جاء	اور اس کلام سے مراد یہ ہے کہ کفار کی طرف سے
من الکفار الی الامام رسولاً	اگر کوئی شخص امام کے پاس پیغمبر بن کر آئے اور
فاسلم واراد ان لا یرجع الی الکفار	مسلمان ہو جائے اور واپس نہ جانے کا ارادہ
لا یردہ الامام الیھم۔ واما ان	کرے تو امام اس کو واپس نہ کرے۔ اب رہی یہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع
لم یحبس ابا رافع وھو من	کو نہیں روکا تھا تو یہ ان چیزوں میں سے ہے جو
المخصوص بہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں۔

حقیقت یہ ہے۔ جیسا کہ میں نے کمبرج یونیورسٹی میں ایک لکچر میں کہا تھا۔ تاریخ مذاہب عالم کا یہ بڑا دردانگیز سانحہ ہے کہ مذہب جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے ماننے والوں کو ایک خاص تربیت دے کر ایک سوسائٹی پیدا کرتا ہے، یہ سوسائٹی ایک تاریخ پیدا کرتی ہے، لیکن دو تین نسلوں کے بعد تاریخ مذہب کی جگہ لے لیتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب اپنی شکل و

---

[1] بذل المجہود جلد ۴ ص ۵۶ مطبوعہ جید برقی پریس۔

صورت میں نظرانداز ہو جاتا ہے اور پھر جتنے فیصلے ہوتے ہیں وہ سب تاریخ کی روشنی میں ہوتے ہیں، چنانچہ اسلام کے ساتھ بھی معاملہ یہی پیش آیا۔ علم الکلام، فقہ، تصوف اور تاویل یہ وہ چیزیں ہیں جن کو تاریخ نے پیدا کیا ہے لیکن یہی چیزیں ہمارے فکر و نظر کا معیار بن گئی ہیں، اور قرآن و سنت جو مذہب کے اصل سرچشمے ہیں ان کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے یعنی اگر آپ مثلاً حنفی ہیں تو وہی کہیں گے جو فقہائے احناف نے کہا ہے اور پھر قرآن و سنت سے اس کے لیے ثبوت فراہم کریں گے، حالاں کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ پہلے آپ براہ راست مخلا بالطبع ہو کر قرآن و سنت کی روشنی میں غور کریں اور اس کے بعد فقہا کے اقوال کا جائزہ لیں۔

بہر حال اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ دار، از روئے قرآن دو یا تین نہیں بلکہ چار ہیں اور ہر دار کسی کی قسم نہیں بلکہ مستقل بالذات ہے اور ان کے احکام الگ الگ ہیں تو اب موقع ہے کہ اصل سوال کا جواب دیا جائے۔ یعنی یہ کہ اچھا! جب ہندوستان دار الحرب نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ جواب یہ ہے ہندوستان جس طرح دار الحرب نہیں ہے دار الاسلام بھی نہیں ہے اور دار العہد اور دار الامن بھی نہیں ہے۔ کیوں؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ جب ہم ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک اس ملک کی شرعی حیثیت مسلمان ملکوں اور حکومتوں کے لیے اور دوسرے خود اس ملک کے مسلمانوں کے لیے، جہاں تک امراول کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت مسلمان ملکوں اور حکومتوں کے لیے "دار العہد" کی ہے، پھر یہ عہد اور مختلف معاملات و مسائل میں اشتراکیت و تعاون جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر ایک مسلمان ملک کا تعلق ہندوستان کے ساتھ زیادہ ہوگا۔ مثلاً ایک ملک کے ساتھ وہ برطانوی کامن ولتھ میں بھی شریک اور مجلس اقوام متحدہ میں بھی؛ اور ایک ملک کے ساتھ یہ دونوں رشتے بھی ہیں اور ان کے علاوہ کچھ اور تجارتی، اقتصادی اور ثقافتی علائق و روابط بھی ہیں، ظاہر ہے ان دونوں قسم کے ملکوں کے ساتھ "دار العہد" ہونے کا رشتہ ایک ہی درجہ اور مرتبہ کا نہیں ہو سکتا، بہر حال جس مسلمان ملک کے لیے ہندوستان جس درجہ کا دار العہد ہے اس ملک کی حکومت کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اس کا احترام

کرے اور عہد و پیمان کے جملہ شرائط کو صورۃً و معنیً پورا کرے۔ ۱؎

اب رہا خود ہندوستان کے مسلمانوں کا معاملہ، تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ ملک دار کی چاروں قسموں میں سے کوئی قسم نہیں ہے۔ دار الحرب نہ ہونے پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے، رہے باقی تین دار! تو اس کا دار الاسلام نہ ہونا ایسا ظاہر ہے کہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس ملک کی حکومت ہی سیکولر اور لادینی ہو اس کے دار الاسلام ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے! اگرچہ ہمارے جن علما نے انگریزوں کے زمانے کے ہندوستان کو انگریزی حکومت کے سیکولر ہونے کے باوجود دار الاسلام کہا ہے۔ وہ موجودہ آزاد ہندوستان کو بدرجۂ اولیٰ دار الاسلام کہیں گے لیکن ہم ابھی آگے چل کر بتائیں گے کہ ان کا وہ فیصلہ غلط تھا اور یہ بھی غلط ہوگا۔ کیوں کہ درحقیقت ان حضرات کا تصورِ دار الحرب و دار الاسلام ہی صحیح نہیں۔

جس طرح ہندوستان دار الحرب اور دار الاسلام نہیں ہے اسی طرح دار العہد اور دار الامان بھی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں دار وہاں پائے جاتے ہیں۔ جہاں مسلمان ایک فریق ہوں اور غیر مسلم فریق ثانی ہوں اور ان دونوں میں علی الترتیب معاہد اور آمن و مستامن ہونے کا رشتہ اور تعلق پایا جائے۔ اور ظاہر ہے یہاں یہ رشتہ مفقود ہے۔ کیونکہ دستوری طور پر اور قومیت (NATIONALITY) کے موجودہ بین الاقوامی تصور کے ماتحت اس ملک کے مسلم اور غیر مسلم سب مل ملا کر ایک قوم ہیں۔ اور حکومت جو ہے وہ اسی قوم کی ہے۔ اور یہ قوم ایک دستور کی پابند ہے جس کو عملی شکل دینا اور اس کی

۱؎ فقہ کی کتابوں میں ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم ملک کسی مسلمان ملک کے ساتھ رویہ میں، دس آنہ احسان و کرم اور لطف و مدارات کا معاملہ کرے تو مسلمان ملک کا فرض ہے کہ اس کے جواب میں وہ غیر مسلم ملک کے ساتھ رویہ میں ۱۲ / یا ۱۴ / معاملہ حسن اخلاق کا کرے اور فقہا اس کی دلیل میں فرماتے ہیں "لاننا احق بالمکارم والاخلاق" یعنی بحیثیت مسلمان کے ہم کو اور زیادہ بہتر مکارم۔ اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں اگر بالفرض ایک مسلمان بھی نہ ہوتا تو یہ ملک مسلم ممالک کے لیے انٹرنیشنل ڈپلومیٹک اصول و ضوابط کے ماتحت پھر بھی دار العہد ہوتا۔ لیکن جبکہ یہاں پانچ ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان بھی آباد ہیں، اور ان کی عظیم الشان روایات اور تاریخ ہے تو اب مسلم ملکوں کے لیے اس ملک کے ساتھ خیر سگالی اور دوستی کا برتاؤ کرنے کی ایک مزید وجہ بھی موجود ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں دونوں سے بجتی ہے۔

حفاظت کرنا حکومت کا فرض ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ دستور نے دیے ہیں نہ کہ اکثریت نے، اور انھیں جو کچھ شکایت کسی معاملہ میں ہو حکومت سے ہی ہوسکتی ہے جس کی تشکیل میں خود مسلمانوں کا ایسا ہی حصہ ہے جیسا دوسروں کا کہ وہ دستور کی حفاظت اور دوسرے لفظوں میں ان کی نمائندگی اور اعتماد کا حق ادا نہیں کر رہی ہے، بہرحال ان وجوہ سے ہندوستان یہاں کے مسلمانوں کے لیے دارالعہد اور دارالامن بھی نہیں ہے۔

اب پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں تو آخر یہ ہے کیا؟ اور شرعی طور پر اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ پہلے زمانے میں ایک ملک میں رہنے والے مختلف مذہبی طبقات کے باہمی تعلقات اور بین الاقوامی علائق و روابط جس نہج اور جس ڈھنگ پر ہوتے تھے، آج صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے، اس بنا پر پہلے قوموں کی جو تقسیم ہوتی اور اس پر جو احکام و مسائل مرتب ہوتے تھے آج ان کا اطلاق ان قدیم مفاہیم و معانی کے ساتھ نہیں ہوسکتا، باب الرقیق اور باب العتق فقہ کے بہت اہم ابواب تھے۔ مگر آج کل یہ بالکل بے کار ہیں۔ کتاب الحدود کی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟ لیکن آج کہاں اس پر عمل ہو رہا ہے؟ فقہ میں "ذمی" اور "ذمیہ" کے احکام و مسائل کا تذکرہ ملتا ہے لیکن آج ذمی کا وجود کس ملک میں ہے؟ یہاں اس سے بحث نہیں کہ کون سی تبدیلی صحیح ہے اور کون سی غلط؟ دیکھنا صرف یہ ہے کہ تبدیلی ہے یا نہیں؟ پس جب تبدیلی ہے تو لازمی طور پر اس کا اثر احکام و مسائل پر پڑے گا۔ فقہ کا مشہور اصول ہے کہ تبدیلِ مذہب سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے لیکن جب یہ بلا عام ہو گئی تو مولانا تھانویؒ نے علماء کے مشورہ اور اُن کے اتفاق سے فتویٰ اس کے برعکس دیا اور اس پر الحیلۃ الناجزۃ للمرأۃ العاجزۃ کے نام سے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا۔ تعلیم قرآن و امامت کی اجرت کو فقہائے متقدمین نے ناجائز کہا ہے لیکن متاخرین نے اسے سندِ جواز عطا فرما دی۔ حلق لحیہ کو فقہائے متقدمین نے علامتِ فسق اور اس کے مرتکب کو مردود الشہادۃ قرار دیا۔ لیکن آج ان لوگوں کی نہ صرف یہ کہ شہادت مردود نہیں ہے بلکہ اسلامی ممالک میں امامت۔ درس قرآن و حدیث اور عہدۂ قضا و افتا کی کرسیوں پر متمکن ہیں۔ جن درختوں کے پھل ابھی پکے نہیں اور

ان کی مقدار معلوم و معین نہیں ہے۔ فرمانِ نبویؐ کے مطابق ان کی بیع حلال نہیں تھی، لیکن آج ہر جگہ یہ کاروبار ہو رہا ہے اور بڑے بڑے زمین دار علماء کر رہے ہیں اور کوئی پوچھتا تک نہیں ہے۔ تصویر کھنچوانا اور رکھنا دونوں ممنوع قرار دیا گیا لیکن آج حجاز مقدس میں بھی اس کا عالم چلن اور رواج ہے۔ فقہا اس بات میں اختلاف کرتے رہے کہ عورت کا چہرہ اور اس کے دونوں ہاتھ بھی ستر میں داخل ہیں یا نہیں لیکن عورت نے پردے کے پیچھے سے وہ جست لگائی کہ جھٹ ہر شعبۂ حیات میں مرد کی شریک و سہیم نہیں بلکہ رقیب بن گئی اور اسلامی سماج نے اس کو اس خوشی سے قبول کر لیا ہے کہ دختران اسلام گرمی کے موسم میں سمندر کے کنارے غسلِ آفتابی لیتی ہیں اور کہیں پتہ بھی نہیں کھڑکتا! یہ سب کچھ کیا ہے؟ اچھا یا برا زمانہ کا انقلاب ہے جس نے سماجی اور معاشرتی زندگی قدروں کو اتھل پتھل کر دیا اور انھیں کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ ان میں کتنی چیزیں ہیں جو پہلے ناجائز تھیں اور اب انھیں فتویٰ کے سہارے جائز کر دیا گیا ہے اور کتنی ہی وہ ہیں جو پہلے کی طرح ناجائز یا حرام اب بھی ہیں لیکن ان سے متعلق بھی حالات کا یہ اثر ضرور ہوا ہے کہ پہلے یہ بالکل ناگوار تھیں اب گوارا ہو گئی ہیں۔ اب اگر ان چیزوں کے گوارا ہونے کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں ہے جب وقت کا مجدد اور مفتی انھیں بھی سند جواز عطا فرما کر محللات میں شامل کرے گا اور دنیا اسے دیکھ کر شیخ سعدی کا مقولہ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کی حکمت و مصلحت پر مہر تصدیق ثبت کرنے پر مجبور ہو گی۔

بین الاقوامی تصور قومیت

بہر حال جہاں تک مسئلہ زیر بحث کا تعلق ہے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگرچہ اسلام میں شخصی یا خاندانی حکومت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اس پر عمل صرف خلافت راشدہ کے زمانہ تک رہا اس کے بعد حکومت خلافت یا امامت سے ملوکیت کی شکل و صورت میں منتقل اور خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ جس کا موقع لگا بادشاہ بن کر بیٹھ گیا اور جب اس کا انتقال ہوا تو تخت شاہی بطور ایک ترکہ کے اس کی آل اولاد یا بھائی بھتیجوں کے حصہ میں آ گیا۔ اس دور میں شاہی خاندان کے علاوہ حدودِ مملکت میں رہنے والے جتنے لوگ ہوتے تھے رعیت یا رعایا (SUBJECT)

کہلاتے تھے لیکن خود رعیت دو حصوں میں تقسیم ہوتی تھی، ایک وہ لوگ جو حکمرانوں کے ہم مذہب ہوتے تھے اور دوسرے وہ جو ان کے ہم مذہب نہیں ہوتے تھے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ ملک کے شہری (CITIZENS) ہوتے تھے۔ لیکن بنیادی حقوق میں یکساں شریک ہونے کے باوجود ان دونوں میں بعض اعتبارات سے فرق و امتیاز ہوتا تھا مسلمان حکومتوں میں یہی فرق "ذمی" کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا تھا۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وہاں کے دستور میں انیسویں ترمیم سے پہلے عورتوں کو تمام حقوق شہریت حاصل تھے لیکن ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ یا آج بھی امریکہ کے جو پیدائشی باشندے ہیں اور جو وہاں آکر آباد ہو گئے ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ دوسری قسم کے لوگ پریذیڈنٹ یا وائس پریذیڈنٹ نہیں ہو سکتے۔ حکومت ایک قسم کی مذہبی ہوتی یا سمجھی جاتی تھی۔ اس بنا پر اس مذہب کے لوگوں کو یک گونہ فوقیت ہوتی تھی۔ تمام دنیا میں یہی طریقہ رائج تھا!

لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ رعایا (SUSIECT) کی جگہ شہریت (CITIZENSHIP) اور قومیت یا جنسیت (NATIONALATY) نے لے لی ہے اور حکومت کے تصور کے ساتھ ساتھ باشندگان ملک کی حیثیت کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ پہلے حکومت چند افراد یا خاندان کی ہوتی تھی، اس بنا پر حکمراں آقا اور باشندگان ملک رعایا سمجھے جاتے تھے لیکن آج حکومت عوام کی نمائندہ اور ان کی منتخب ہوتی ہے۔ اور قرون وسطیٰ کے یورپ میں جو جاگیردارانہ نظام سلطنت (FEUDAL SYSTEM OF GOVERNMENT) رائج تھا۔ اب اس کے بجائے علاقائی خود مختاری (TERRITORIAL STATE SO.EREIGNTY) کا رواج ہے اور جسے ہم اسٹیٹ کہتے ہیں وہ سب اہل ملک کا ایک کارپوریشن (CORPORATION OF MEMBER INDIVIDUALS) ہے، یورپ کا یہ تصور اسٹیٹ اور اس کے نتیجہ میں شہریت اور قومیت کا یہ تصور اب عالمگیر اور بین الاقوامی ہے جسے مسلم اور غیر مسلم سب ممالک نے تسلیم کر لیا ہے اور پاسپورٹ اور ویزا اور شہریت و قومیت سے متعلق تمام بین الاقوامی مسائل و معاملات کا انتظام و انصرام اسی پر ہے۔

دارالاسلام کی تعریف

شہریت۔ قومیت اور اسٹیٹ ان جدید مسلمہ بین الاقوامی تصورات کو ذہن میں رکھ کر اب اس پر غور کیجیے کہ آج صحیح معنی میں دارالاسلام کس ملک کو کہا جا سکتا ہے؟ فقہا کی تصریح کے مطابق دارالاسلام میں تین شرائط کا ہونا ضروری ہے:

(۱) صدر مملکت جسے فقہا عام طور پر امام کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اس کو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے ناموس شریعت کا محافظ اور پاسبان ہونا چاہیے۔

(۲) ملک میں اسلامی قانون رائج ہونا چاہیے جس کا بنیادی مقصد، عدل اور احسان کا قیام اور فواحش و منکرات کا استیصال ہے۔

(۳) ہر مسلمان خواہ کسی ملک اور علاقہ کا باشندہ ہو اور اس اعتبار سے ایک مقامی قومیت رکھتا ہو اس کو دارالاسلام میں بلا روک ٹوک آنے کی اجازت ہوگی اور اسے وہاں پہنچتے ہی وہ تمام شہری حقوق حاصل ہو جائیں گے جو وہاں کے پہلے سے رہنے والوں کو حاصل ہیں، وہ وہاں زمین خرید سکتا ہے، کھیتی باڑی اور کاروبار کر سکتا ہے۔ ملازمت میں لیا جا سکتا ہے اور جاگیر جائداد پیدا کر سکتا ہے، اسے اختیار ہے جب تک چاہے وہاں قیام کرے حکومت اس کو اخراج کا حکم نہیں دے سکتی اسی بنا پر یہ مسلمان اگر کسی دوسرے ملک میں کسی جرم کا ارتکاب کر کے آیا ہے تو دارالاسلام کی حکومت کو حق ہوگا کہ وہ اسے سزا دے۔

دارالاسلام کے ان شرائط سہ گانہ کو جو تقویمی ہیں نہ کہ تقسیمی، پیش نظر رکھ کر سوچیے کہ دارالاسلام کی یہ تعریف آج کسی مسلم ملک پر صادق آتی ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے ایک موقع پر کہا تھا پھر کہتے ہیں کہ اگر آپ نے یہ کوئی اصطلاح ہی بنا لی ہے کہ جس ملک میں مسلمان اکثریت میں ہوں گے آپ اسے دارالاسلام کہیں گے تو بات دوسری ہے۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ جس ملک میں فواحش و منکرات عام ہوں گے —————— اور ملک کا قانون ان کا انسداد نہ کرتا ہو اس کو دارالاسلام کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شاندار محل ہو جس میں برہنہ عورتوں کے مجسمے جا بجا نصب ہوں اور اس کے پر تکلف آراستہ و پیراستہ

کمروں میں کہیں طبلہ پر تھاپ پڑ رہی ہو، کہیں گھنگرو بج رہے ہوں اور کہیں ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں" کا ہنگامہ برپا ہو اور ان تمام خصوصیات کے باوجود آپ فرمائیں کہ یہ قصر رفیع الشان "شیخ حرم" کی رہائش گاہ ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ لامشاحۃ فی الاصطلاح کی آڑ لے کر آپ تسمیۃ الشئ باسم غیرہ کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ علاوہ ازیں آج پاسپورٹ اور ویزا کے جو قواعد وضوابط ہیں ان کی سختی کا یہ عالم ہے کہ جو مسلمان حجاز مقدس جاتے ہیں، ان کو ویزا میں یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ وہاں کوئی ملازمت یا کاروبار نہ کریں گے۔ اور وہاں بھی شہری حقوق حاصل کرنے کے وہی قواعد وضوابط ہیں جو دوسرے ملکوں میں ہیں، ان امور کے پیش نظر دو حال سے خالی نہیں، اگر دار الاسلام کی تعریف اور اس کے خصوصیات اب بھی وہی ہیں جو فقہ کی کتابوں میں درج ہیں اور جن کی وجہ سے اسم اور مسمی میں مطابقت پیدا ہوتی ہے تو پھر بتانا ہو گا کہ ان اوصاف وخصائص کا حامل کون سا ملک ہے اور یا دار الاسلام کی کوئی نئی تعریف ایسی کرنی ہو گی جس کے ماتحت مسلمانوں کی اکثریت والے ملک دار الاسلام کہلا سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ باوجود ان تمام باتوں کے جن کا ذکر ابھی ہوا مسلمانوں کی اکثریت والے ممالک جہاں مسلمان صدر مملکت ہے فقہا کے ان بیانات کی روشنی میں جنھیں ہم سابق میں نقل کر آئے ہیں دار الاسلام ہی ہیں، لیکن ان ممالک کی کیا خصوصیت ہے۔ ان بیانات کی رو سے تو ہندوستان اور دوسرے غیر مسلم اکثریت کے ملک جہاں مسلمانوں کی مذہبی آزادی مسلم ہے وہ بھی دار الاسلام قرار پاتے ہیں۔ چنانچہ آپ پڑھ ہی آئے ہیں کہ برطانوی عہد کے ہندوستان کو کس کثرت سے علما نے دار الاسلام لکھا اور کہا ہے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ چونکہ دار الاسلام اور دار الحرب کی اصطلاح کہیں قرآن میں نہیں ہے اور عہد نبوت وعہد صحابہ میں بھی اس کا سراغ نہیں ملتا، پھر قدیم مصنفین کی کتابوں میں عام طور پر بجائے دار الاسلام کے "دارنا" "ہمارا ملک" یا "ہمارا وطن" کے الفاظ ملتے ہیں [1] علاوہ ازیں کتب فقہ میں دار الاسلام کے ساتھ "دار المسلمین" کا لفظ بھی مستعمل ہوا ہے [2] اور اس زمانہ میں بدقسمتی سے کوئی ملک ایسا نظر بھی نہیں آتا جس پر اسلام فخر

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جدید ایڈیشن جلد ۲ ص ۱۲۷۔

[2] ملاحظہ کیجیے المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۱۱۴ باب المرتدین۔

کر سکے اور جو (فقہا کے بیانات سے قطع نظر) صورۃً ومعنیً دار الاسلام ہو، اس بنا پر ہمارے زمانے میں شہریت اور قومیت یا جنسیت کا جو بین الاقوامی تصور قائم ہو گیا ہے اور جسے مسلم اور غیر مسلم سب ممالک نے اختیار کر لیا ہے ہم کیوں نہ اس کی روشنی میں دار کی ایک نئی قسم معین کریں۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مسلم اکثریت کے ممالک کا ذکر محض ضمناً آگیا ہے۔ ورنہ اس مقالہ کا اصل موضوعِ بحث ہندوستان ہے اور اسی سے ہمیں سروکار ہے۔ یہاں صورت حال یہ ہے کہ سب ہندوستانی مذہب اور زبان اور رنگ ونسل کے اختلاف کے باوجود دستوری اور آئینی طور پر ایک قوم (NATION) ہیں اور مسلمان بھی اس کا ایک جزو ہیں، چنانچہ پاسپورٹ، ویزا، شہری حقوق، قومی اور بین الاقوامی معاملات ومسائل۔ ان سب امور میں ان کے ساتھ جو معاملہ یا برتاؤ ہوتا ہے وہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے، ان کی یہ وہ حیثیت ہے جس کو خود انھوں نے تسلیم کیا ہے اور انٹرنیشنل لا کے ماتحت دنیا کی سب مسلم اور غیر مسلم حکومتوں اور قوموں نے کیا ہے۔ اس بنا پر ہندوستان کسی ایک مذہب یا گروہ کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا وطن (دار) ہے جو انڈین نیشنلٹی رکھتے اور انڈین نیشن کا جزو ہیں۔

ایک انسان کا دوسرے انسان سے یا ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے جو تعلق یا رابطہ (ASSOCIATION) ہوتا ہے وہ بہت سے دائروں میں تقسیم ہے اس سلسلے کا سب سے بڑا دائرہ وہ ہے جس میں ربط بر بنائے انسانیت ہوتا ہے، اس کے بعد مذہب اور پھر وطن کے دائرے ہیں۔ کسی دائرے کے بڑے ہونے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس سے چھوٹے دائروں سے زیادہ اہم ہے۔ البتہ ہر دائرہ کے حدود اور اس کے اپنے مقتضیات ومطالبات ہیں بہر حال انسانی علائق وروابط کے یہ دائرے طبعی اور فطری ہیں، اس بنا پر اسلام بھی انھیں تسلیم کرتا اور ان کے حدود اربعہ متعین کر کے ہر ایک کے واجبات ومطالبات کی تشخیص کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں پیغمبروں نے جگہ جگہ اپنے اہل وطن کو یا قومنا۔ یا قومی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان لوگوں کے لیے جن میں آپ مبعوث ہوئے قوم کہا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن میں امۃ کا لفظ بھی قوم کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وما من امة الا خلا فیه نذیر — اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر یہود سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بھی مسلمانوں اور یہود سب کو امۃ واحدۃ فرمایا۔ پس جب اس وطنی اشتراک کو قرآن تسلیم کرتا ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے تسلیم کیا اور اس کی اساس پر آپ نے غیر مسلموں سے معاملات طے کیے اور ان لوگوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا اس بنا پر ہندوستان کی شرعی حیثیت یہاں کے مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ یہ ان کا الوطن القومی (NATIONAL HOME) ہے اور اس کے لیے جداگانہ احکام ہیں یوں تو اسلام کی تعلیمات کی رو سے دنیا کے سب انسانوں کے ساتھ ہی بر و قسط اور احسان و کرم اور خدمت و اعانت کا معاملہ ہونا چاہیے۔ لیکن الاقرب فالاقرب کے ماتحت جو جتنا قریب ہے اتنا ہی اس کا حق ہے اسی بنا پر قرآن میں ذوی القربیٰ کو دوسرے مستحقین امداد و اعانت پر مقدم رکھا گیا ہے۔

قومی وطن ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس ملک کو ترقی دینے اور اسے مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور جہاں کہیں ظلم و بے انصافی ہو اس کے خلاف آواز اٹھائیں اور عدل و احسان کے قیام اور منکر و فحشا سے اس ملک کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کے ذہن اور دماغ، ان کی صلاحیت ان کی دولت و ثروت اور ان کے اخلاق و کردار پر صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ اس ملک کے ہر مرد اور ہر عورت کا حق ہے۔ جس زمانہ میں مسلمانوں کی طاقت و قوت اور ان کی حکومت و سلطنت کا ڈنکا بجتا تھا اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کا عمل اصول فقہ کے اس مشہور اصول پر تھا:

المسلمُ والکافرُ فی مصائبِ الدُّنیا سواءٌ[1] — مسلمان اور غیر مسلم دنیوی حوادثات و مصائب میں برابر ہیں۔

اسلام میں شرک سے زیادہ مبغوض کوئی چیز نہیں، لیکن اس کے باوجود مشرک

---

(1) THE MUSLIM CONDUCT OF STATE BY Dr. HAMIDULLAH P. 71

کے متعلق بھی حکم یہ ہے کہ اگر وہ پناہ مانگے تو مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اُسے پناہ دے قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ	اگر کوئی ایک مشرک بھی تجھ سے پناہ طلب
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ	کرے تو اس کو پناہ دے۔

پس جس مذہب کی تعلیمات یہ ہوں اس کے ماننے والوں کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ برادران وطن اور خود وطن کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہونا چاہیے۔

تمام شد

PRINTED BY THE MANAGER AT THE ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY PRESS
ALIGARH